دشت کا بھیڑیا

الیاس سیتاپوری

ملن کمپنی۔ اردو بازار۔ دہلی

اس ناول کو دلچسپ بنانے کے لئے مصنف نے تاریخی کردار، مقامات اور واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے تخیل کے سہارے فرضی واقعات بھی شامل کئے ہیں۔

قیمت : پندرہ روپے Rs 15/=

نام کتاب : دہشت کا بھیڑیا
مصنف : الیاس سیتاپوری
بار اوّل : ۱۹۸۵ء
طابع : جمال پریس۔ دہلی

ناشر
ملن کمپنی۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

انتساب

میرے ناول "تلاش بہشت" کی ہیروئن
راحیلہ کے نام

الیاس سیتاپوری

اُس کا ایک ہاتھ برفانی ریچھ کی کھوپڑی پر رکھا ہوا تھا۔ وہ برفانی ریچھ کبھی اس پر غرّایا ہوگا، اس لیئے اس کی کھال کھینچ لی گئی تھی کیونکہ وہ وحشی انسان کسی کی غرّاہٹ برداشت نہیں کرتا تھا۔ اب اس خونخوار ریچھ کی کھال پر وہ بیٹھا ہوا شراب پی رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک کاسہ سر تھا۔ اس پیالہ نما کاسہ سر سے کبھی کبھی شراب چھلک جاتی تھی۔ اس نے نشے میں غرّاتے ہوتے اپنے جانباز ساتھیوں سے کہا۔

"میں چنگیز خاں کا پوتا ہوں۔ وہ چنگیز خاں جو خونخواری میں بے مثال تھا۔ وہ ایسا درندہ تھا کہ جانوروں کی آنتیں تک کھا لیتا تھا اور ان کا خون پی جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں رات کی تاریکی میں دور تک چھپے ہوئے دشمنوں کو دیکھ لیتی تھیں

یا پھر وہ آنکھیں بند کر کے اُن کی بو سونگھ لیتا تھا۔ اس کے حواس جانوروں کی طرح تیز تھے میں اُسی چنگیز خاں کا پوتا ہوں۔"

وہ کاسۂ سر کو ہونٹوں سے لگا کر گھونٹ گھونٹ شراب پینے لگا۔ ذرا دیر کے لئے خیمے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ خیمے کے باہر برف گر رہی تھی۔ اس کے چار عارضہ جاں نثار ساتھی سمور میں لپٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جانوروں کے سینگوں سے بنے ہوئے پیالے تھے اور وہ سب بکری کے دودھ کی سٹرائی ہوئی شراب نوش کر رہے تھے۔ یہ چنگیز خاں کی پسندیدہ شراب تھی۔ اُس کے ہر گھونٹ کے ساتھ اس کا پوتا اپنے دادا کی یاد تازہ کر رہا تھا۔

"ایک بار خاقانِ اعظم (چنگیز خاں) مجھے اپنے ساتھ شکار کھیلنے لے گیا۔ مجھ سے پہلے میرے دونوں بڑے بھائی منگو خاں اور قبلائی خاں اس کے ساتھ شکار کھیل چکے تھے۔ خاقانِ اعظم ہماری شجاعت اور حوصلوں کو آزمایا کرتا تھا۔ ہوا یوں کہ راستے میں ایک دشمن سے سامنا ہو گیا۔ خاقانِ اعظم نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تو اس دشمن کو ہلاک کر سکتا ہے؟"

میں نے اس کا عملی طور سے جواب دیا اور دشمن کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ دشمن مجھے ایک کم عمر نوجوان سمجھ کر مقابلے کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ مجھے اپنے دادا کے جنگی اصول یاد تھے۔ وہ یہی سمجھاتا تھا کہ دشمن کتنا ہی دلیر اور مضبوط کیوں نہ ہو، اگر تم اس کے پاؤں تلے کی زمین سرکا دو تو وہ گر پڑے گا۔

میں نے یہی کیا۔ پہلے ہی حملے میں اس کے گھوڑے کو زخمی کر دیا۔ وہ

زمین پر گر پڑا۔ اب وہ میرے مقابلے پر کمزور ہو گیا کیونکہ میں گھوڑے پر تھا اور وہ پیدل شکست کھائے ہوتے سپاہی کی طرح اِدھر سے اُدھر بھاگتے ہوئے میرے حملوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا اور موقعہ پا کر میرے حملوں کا جواب دے رہا تھا۔ لیکن اس طرح وہ زیادہ دیر تک مقابلے پر نہ ٹھہر سکا۔ ایک موقع پر تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی وہ گھبرا کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنے لگا۔ ایسے وقت چوہے بلی کے کھیل میں بڑا مزا آتا ہے۔ چوہا بھاگتا ہو اور بلی اُسے پنجے مار مار کر چھوڑتی ہو۔ اسی طرح میں اپنے برق رفتار گھوڑے پر قہقہے لگاتا ہوا اس کے قریب پہنچتا تھا اور اُسے تلوار کا ایک زخم لگا کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ وہ زخم کھا کر گرتا تھا تڑپتا تھا، پھر اُٹھ کر بھاگنے لگتا تھا۔

میرا دادا خاقانِ اعظم بہت خوش ہوا۔ وہ اسی طرح کے کھیل پسند کرتا تھا۔ اس وقت ہمارے قہقہے جنگل کے سناٹے میں گونج رہے تھے اور ہمارا شکار اب زمین پر گر کر دم توڑتی ہوئی آواز میں فریاد کر رہا تھا۔ فریاد کرنے کا دستور بہت پرانا ہے اور پرانی باتیں متاثر نہیں کرتیں۔ میں نے گھوڑے سے اُتر کر تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔

ایسے وقت خاقانِ اعظم ہم تمام بھائیوں سے پوچھتا تھا "بتاؤ ایک بگھاتر (بہادر) کو سب سے زیادہ مسرت کب حاصل ہوتی ہے؟"

میرے بھائیوں نے جواب دیا۔ "دشمن پر فتح پا کر اور اسے ہلاک کر کے سب سے زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہے۔"

میرے دادا کا تسلّی نہ ہوئی۔ میں نے جواب دیا۔ ایک بہادر کے لئے سب سے مسرّت بھرا لمحہ وہ ہے جب دشمن اس کے آگے بھاگ رہا ہو اور وہ اسے تڑپا تڑپا کر مار رہا ہو۔ دُور سے اس کے بیوی بچّوں کے رونے اور فریاد کرنے کی آوازیں آ رہی ہوں اور یہ خیال تقویت پہنچا رہا ہو کہ دشمن کی موت کے بعد اس کے خیمے کا تمام سامان ہمارا ہو گا۔ اس کے گھوڑے ہماری ران کے نیچے ہوں گے اور اس کی حسین عورتیں ہماری آغوش میں سارہا کریں گی۔"

خاقانِ اعظم نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور میری پیٹھ ٹھونک کر کہا "شاباش اقو میرا صحیح جانشین ہے تو دشمنوں کو رگید کر ہلاک کرنے کا فن جانتا ہے۔ میں نے تیرا نام ہلاکو خاں رکھ کر غلطی نہیں کی ہے۔"

یہ کہہ کر ہلاکو خاں ذرا خاموش ہوا اور کاسۂ سر کی باقی ماندہ شراب حلق سے اُتارنے لگا۔ اس کے ساتھی اس سے مرعوب تھے اور اسے تعریفی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اُس نے کہا۔

"دوروز بعد دادا نے مجھے اپنے خیمے کے سامنے طلب کیا وہاں اُس قبیلے کے بوڑھے اور دوسرے قبیلوں کے سردار الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ دادا نے اس کاسۂ سر کو میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تیری دلیری اور دلیرانہ جواب کا انعام ہے بتا کہ یہ کس کی کھوپڑی کو تراش کر پیالہ بنایا گیا ہے؟"

"میں سمجھ گیا۔ یہ اُسی دشمن کی کھوپڑی ہے، جسے میں نے دو روز پہلے ہلاک کیا تھا۔"

"ہاں، تو دلیر بھی ہے، دانا بھی ــــ اپنے مردہ دشمن کے کاسۂ سر کو پہچان لیتا ہے۔ اب سے تو اسی پیالے میں شراب نوش کیا کرے گا۔ یہ پیالہ تجھے یاد دلاتا رہے گا کہ دشمن کتنے حقیر ہوتے ہیں۔ کھوپڑی کے اس حصے میں جہاں دشمن کا سازشی دماغ ہوتا ہے، وہاں سے تمہارے ہونٹوں کے لئے شراب چھلکتی رہے گی۔"

یہ کہہ کر خاقانِ اعظم نے اس کاسۂ سر میں پہلی بار مجھے شراب پیش کی۔ میں نے اس پیالے کو تھام لیا۔ پھر خاقانِ اعظم نے میری کمر کی پیٹی میں ہاتھ ڈال کر مجھے ایک ہاتھ سے اٹھایا۔ دیکھ رہے ہو کہ میں کس قدر بھاری بھرکم ہوں اور میرا دادا بوڑھا ہو چکا تھا مگر اس میں اس وقت بھی اتنی قوت تھی کہ اس نے ایک ہاتھ سے مجھے اپنے سر سے بلند کرتے ہوئے تمام سرداروں کو مخاطب کیا۔

"دیکھو یہ میرا پوتا ہے۔ یہ میرے تخت کا وارث نہیں بنے گا مگر میری تلوار کا وارث رہے گا۔ اس کی فطرت سے ظاہر ہے کہ یہ ستون کی طرح کسی ایک مقام پر جم کر نہیں رہے گا۔ یہ دشمنوں کو روندنے اور آگے بڑھتے رہنے کا عادی ہے۔ میرے بعد یہ اس دشت سے باہر جائے گا اور اپنے گھوڑے تہذیب کی چھاتی پر دوڑائے گا۔ اسے اچھی طرح دیکھ لو، یہ میرا پوتا ہلاکو خاں ہے۔"

ہلاکو خاں کے ہاتھ میں کاسۂ سر خالی ہو گیا۔ وہ چنگیز خاں کی پسندیدہ شراب کا آخری گھونٹ بھی پی چکا تھا اور ماضی کی یادوں سے واپس آگیا تھا۔

وہ بہت ہی تیز شراب تھی۔ ایک ہی جرعہ میں کھوپڑی گرم ہو جاتی تھی، اور کڑی سردیوں میں بھی پسینہ پھوٹنے لگتا تھا۔ اُس نے نشے میں جھومتے ہوئے کہا۔

"خاقانِ اعظم نے میری دلیری اور ہلاکت خیزی کے متعلق کتنی ہی پیشگوئیاں کی تھیں لیکن وہ ایک بات نہیں جانتا تھا کہ کبھی میرا مزاج عاشقانہ بھی ہو گا۔ آہ میری محبوبہ! میری حسین دوقوزہ! میں تیری آرزو پوری کرنے کے لئے تمام مسلمان بادشاہوں کو اور ان کے مذہب اسلام کو نیست و نابود کر دوں گا۔"

اُس نے شراب کے پیالے کو، یا دشمن کے کاسۂ سر کو ایک طرف اچھال دیا۔ پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "کسی مسلمان کی کھوپڑی میں شراب پیتے وقت کتنا لطف آئے گا۔ اُس وقت میری حسین دوقوزہ میرے پہلو میں مسکرا رہی ہو گی۔"

وہ نشے میں ڈگمگاتا ہوا ریچھ کی کھال پر سے اُٹھ گیا۔ مردہ ریچھ غرانے کے انداز میں دانت نکالے ہوئے تھا۔ ہلاکو نے اس کی کھوپڑی پر ایک چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"میرے نزدیک مسلمانوں کی غراہٹ مردہ ریچھ کی طرح ہے مگر حسین عورتیں مردہ جانوروں سے بھی ڈرتی ہیں۔ دوقوزہ بھی ان سے سہمی رہتی ہے۔ میں اُن مسلمانوں کی کھالیں کھینچ کر اُن کا ایک بستر بنواؤں گا اور اس بستر پر اپنی عیسائی محبوبہ کو سلاؤں گا۔ ہا ہا ہا۔۔۔"

وہ قہقہے لگاتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔ باہر برف گر رہی تھی۔ آسمان کا

رنگ گہرا نیلا تھا۔ رات کی سیاہی کے باوجود گلیشیروں سے اجلا برف کے چشمے سے ہلکی نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ وحشی فلکیات کے علم سے بے بہرہ تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ برف کے تودوں پر کن سیاروں کی روشنی منعکس ہوتی ہے؟ وہ صرف آسمان کو اپنا خدا سمجھتے تھے۔ آسمان جو آندھیوں، سیاہ مہیب بادلوں اور بجلیوں سے اپنے قہر و غضب کا اظہار کرتا تھا اور وہی آسمان جب اُجلا اُجلا نیلا چمکتا تو وہ سمجھتے کہ اس وقت وہ انسانوں پر مہربان ہے لہٰذا وہ آسمان ہی ان کا خدا تھا اور وہ اس آسمان کو "مونگ کے تینگری" کہہ کر اس سے خوف کھاتے تھے۔ وہ کسی مذہب سے متاثر نہیں تھے۔ لیکن ہلاکو پہلا وحشی تھا جو حسین دوقوزہ سے متاثر تھا اور دوقوزہ ایک نسطوری عیسائی تھی۔

رات کا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گلیشیروں کی نیلی جھلملاتی روشنی میں دور تک خیمے نظر آرہے تھے وہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا دوقوزہ کی طرف جارہا تھا۔ راستے میں راہب ولیم سے سامنا ہوگیا۔ راہب نے ہاتھ اٹھا کر دعائیہ انداز میں کہا۔

"آسمانی باپ تم پر مہربان ہے۔ تمہاری تلوار کی چھاؤں میں ایک حسین عورت تمہاری فتح و نصرت کے دروازے کھولتی جائے گی۔ میرا نیک مشورہ ہے کہ صلیب کی چھاؤں میں آجاؤ۔"

ہلاکو نے اس کے سینے پر لٹکی ہوئی پیتل کی صلیب کو دیکھ کر کہا۔ یہ پیتل کی صلیب ہے۔ لوہا اور پیتل دوہا تھوں کی قوت سے مڑ جاتے ہیں۔

کہو، تو میں تمہاری اس صلیب کو ابھی موڑ دوں۔ جو چیز مڑ جائے، جھک جائے اُس کی چھاؤں میں چنگیزی خون کبھی نہیں آتا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ راہب ولیم اسے ایسے انداز میں مسکرا کر دیکھتا رہا جیسے کوئی عاقل بوڑھا نادان بچے کو دیکھتا ہے۔۔ پھر اس نے زیر لب کہا۔

"زلفوں میں کتنے ہی پیچ وخم ہوتے ہیں۔ حسین عورت کی زلفیں کہیں جگہ سے مڑتی اور جھکتی ہیں اور تو اُسی کی چھاؤں میں جا رہا ہے۔ وہ جو صلیب کے سامنے گھٹنے ٹیکتی ہے۔"

ہلاکو اس کی بڑبڑاہٹ نہ سن سکا، آگے بڑھتا چلا گیا۔ آگے رات کے نیلے روشن اندھیرے میں ایک بوڑھا کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اور اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے۔ وہ مونگ کے تینگری یعنی آسمان کی پوجا کر رہا تھا اور آسمان سے چنگیز کی نسل کے لئے امان اور خوش نصیبی طلب کر رہا تھا۔ وہ اُس قبیلے کا پجاری بھی تھا، طبیب بھی اور جادوگر کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ ایسے پجاری اور جادوگر اس قبیلے کی زبان میں شامان کہلاتے تھے اور نہایت محترم اور قابلِ تعظیم سمجھے جاتے تھے۔

ہلاکو خاں اسے دیکھ کر احتراماً رُک گیا۔ شامان نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں کہا۔

"وہ راہب تجھے ایک مذہب دے کر مہذب بنانا چاہتا ہے۔ اچھی طرح سن لے۔ انسان تہذیب کی پابندی میں رہ کر بزدل اور کمزور بن جاتا ہے۔"

اور تو دشت کا بھیڑیا ہے۔ تہذیب تجھے بزدل بکیٹر بنا دے گی۔ کیا تو نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کا خدا اور عیسائیوں کا آسمانی باپ کہیں نظر نہیں آتا مگر ہمارا آسمان ہر جگہ نظر آتا ہے۔ ہم دشت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہاں بھی جاتے ہیں، ہمارا خدا، یہ جاودانی آسمان ہمارے سروں پر اپنا سایہ رکھتا ہے۔"

"ہاں میں سمجھتا ہوں۔ اگر نہ سمجھتا، تب بھی کسی مذہب کو قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ دادا خاقانِ اعظم بھی مذہب کے بغیر زندہ تھا۔ میرا باپ بھی کسی مذہب والے سے متاثر نہیں ہوتا۔ پھر میں اپنے بڑوں کا راستہ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ وہ راہب دیوانہ ہے، ہمارے چٹانی ارادوں سے واقف نہیں ہے۔"

"عورت کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ چٹانوں میں سوراخ کر دیتی ہے۔ اس کے سامنے نہ جاؤ، اس کی قربت سے پرہیز کرو۔ ہزاروں بہادروں نے اپنا اطمینانِ قلب عورتوں کی وجہ سے کھویا ہے۔ ہزاروں بلند پایہ اور مشہور لوگ عورت کی بدولت زندہ درگور ہو گئے۔"

ہلاکو خاں سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ شامان آسمان کی سچی باتیں کرتا ہے لیکن عشق کے آگے آسمان کی سچائی بھی متاثر نہیں کرتی۔ وہ بوڑھے شامان سے بحث نہ کر سکا کیونکہ جس طرح بوڑھوں کی نصیحتیں جوانوں کے کام نہیں آتیں۔ اسی طرح جوانوں کے جذبات بوڑھوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور دو فوزہ سمجھانے کی چیز نہیں تھی۔ وہ صرف دل کی

پھیمر وغیرہ کنوں سے سمجھی جا سکتی تھی۔

وہ ایک خیمے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ وہ اس کے باپ تولوئی کا خیمہ تھا۔ تولوئی کی شجاعت اور ظالمانہ فطرت سے دشت کے تمام لوگ تھر اتے تھے۔ اس نے اپنے باپ چنگیز خاں کی طرح کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ دن رات شراب کے نشے میں ڈوبا رہتا تھا۔ شراب نوشی کی زیادتی نے اسے عمر سے زیادہ بوڑھا بنا دیا تھا۔ ہلاکو جانتا تھا کہ اس کا باپ پیتے پیتے مدہوشی میں گہری نیند سو چکا ہو گا۔ وہ خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر آ گیا۔ اندر اپلوں کی انگیٹھی دہک رہی تھی خیمے کی محدود فضا میں ہلکی ہلکی گرمی تھی۔ انگیٹھی سے ذرا دور اس کا بوڑھا باپ جس نے کبھی کسی سے شکست نہیں کھائی تھی، شراب سے مات کھا کر جانور کی طرح چت ہو گیا تھا۔

خیمے کے ایک گوشے میں دوقوزہ صلیب کے سامنے گھٹنے ٹیکے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے کی سانس لیتی ہوئی بلندیوں پر ٹھہر گئے تھے۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے گلابی ہونٹوں کی لرزش میں ہلاکو خاں کو اپنا نام تھر تھراتا ہوا سنائی دے رہا تھا۔ انگیٹھی کے دہکتے ہوئے انگارے سرخ تھے۔ خیمے کا رنگ نیلا تھا اور دوقوزہ گلابی گلابی تھی۔ ان رنگوں کی چھاؤں میں وہ بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔

چنگیز خان کے خاندان میں دور دراز کے قبیلوں سے دو چار ایسی حسین عورتیں آ گئی تھیں، جو اپنے بچپن سے نسطوری عیسائیوں کے ساتھ عبادت

کرتی رہی تھیں۔ دوقوزہ کرائت قبیلے کے سردار کی بھتیجی تھی۔ چنگیزی قبیلے میں بیاہ کر آنے سے پہلے اُس نے یہ شرط منوالی تھی کہ اُسے مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اُس دوشیزہ نے قیامت کا حُسن پایا تھا۔ دُور دُور تک اس کے حُسن اور مُنہ زور شباب کی مثال نہیں ملتی تھی۔ ہلاکو کے باپ تولوئی نے اُس کے حُسن سے متاثر ہو کر اس کی شرط منظور کر لی تھی۔ اس طرح اس وحشی قبیلے میں ایک صلیب آگئی تھی۔

دوقوزہ نے سر اُٹھا کر دیکھا تو ہلاکو خاں کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر اس کے قریب آئی اور آہستگی سے بولی "تجھے اتنی رات کو یہاں نہیں آنا چاہیئے۔"

"تو شراب کی طرح میرے لہو میں دوڑ رہی ہے۔ میرے لہو کی حرارت مجھے تیرے پاس لے آئی ہے۔ میں یہاں نہ آؤں، تب بھی تجھے چاروں طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ پتہ نہیں تو نے کیا جادو کر دیا ہے۔"

"میں بھی یہی سوچتی ہوں کہ تو نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ مرد کی جادوگری یہی ہے کہ وہ جوان مرد ہو، تلوار سے ملکوں کو اور نظروں سے عورتوں کو فتح کر لیتا ہو۔ لیکن تیرا باپ اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ اس کے ہاتھ تلوار کے دستے اور عورت کی کلائی پر کانپ جاتے ہیں۔"

"آدوقوزہ! میں تیری بے چین کلائی کو تھامتا ہوں۔ میرے ہاتھ فولادی تلواروں کو توڑ دیتے ہیں اور تیری کلائی تو بہت نازک ہے۔"

اُس نے کلائی تھامنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وہ جلدی سے ایک

قدم پیچھے چلی گئی۔ "نہیں، ابھی مجھے ہاتھ بھی نہ لگانا"

"کیوں ہاتھ نہ لگاؤں؟ کیا تو مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے؟"

"کرتی ہوں مگر ابھی میں تیرے باپ کی بیوی ہوں"

ہلاکو خاں بے بسی سے اُس حسینہ کا مُنہ تکنے لگا۔ حسینہ نے کہا۔

"میری تہذیب اجازت نہیں دیتی کہ میں تیرے باپ کی زندگی میں تجھ سے تعلقات قائم کروں اور تیرے قبیلے کے رواج کے مطابق تو مجھے اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جبکہ تو مجھے اپنے باپ کے خیمے سے اُٹھا کر اپنے خیمے میں لے جائے اور اُسے مقابلے پر مجبور کر کے اُسے مار ڈالے"

"میرا باپ میرے مقابلے میں بہت بوڑھا ہے مگر میں اسے قتل نہیں کروں گا۔ چنگیز کے خاندان میں آج تک باپ بیٹوں اور بھائیوں نے کبھی ایک دوسرے کا خون نہیں بہایا"

"میں جانتی ہوں، تم لوگوں میں بڑا اتحاد ہے اس لئے تُو باپ کو ہلاک نہیں کرے گا۔ میری جدائی میں بے چین رہے گا اور اس کی موت کا انتظار کرتا رہے گا"

"ہاں۔ وہ چند دنوں کا مہمان ہے، پھر میں تجھ سے شادی کر لوں گا"

"تیرے باپ سے شادی کرنے سے پہلے میں نے اپنی ایک شرط منوائی تھی۔ اس شرط کے مطابق مجھے اس خاندان میں ہمیشہ مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ خواہ میں تیرے باپ کے پاس رہوں یا تیرے پاس — لیکن تیری بیوی بننے سے پہلے ہی میں نے اپنی ایک شرط سُنا دی ہے۔ میرا خیال

ہے کہ تجھے وہ شرط یاد ہوگی؟"

"میں تجھے نہیں بھول سکتا۔ پھر تیری شرط کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ میں تیری شرط کے مطابق مشرقِ وسطیٰ میں تیری صلیب بلند رکھوں گا اور اسلامی پرچم کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔ آج تک ہم نے کبھی مذہبی جنگ نہیں لڑی۔ تو صلیب کے سائے سائے میری آغوش میں آنا چاہتی ہے۔ میں تلوار کے سائے میں محبت کی جنگ لڑتا رہوں گا۔"

"تو پھر یہاں سے چلا جا اور وقت کا انتظار کر۔ ابھی تو مجھے ہاتھ لگائے گا تو تجھ پر آسمانی عذاب نازل ہوگا۔"

وہ وحشی زمین کی ناقابلِ تسخیر قوتوں سے بھی ٹکرا جاتے تھے مگر آسمانی بلاؤں سے سہم جاتے تھے۔ دو قوزہ نے خیمے کا پردہ اُٹھا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کی کہ چلے جاؤ۔ وہ خیمے سے باہر آ گیا۔

تب دو قوزہ نے بڑی آہستگی سے اُسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔

"ہولاکو — ! تو دشت کا بھیڑیا ہے۔ میں تجھ پر مرتی ہوں۔ مگر میں تیرے ساتھ اُسی بستر پر سوؤں گی، جو مسلمانوں کی کھالوں سے بنایا گیا ہوگا۔ جب تک وہ وقت نہیں آتا، اُس وقت تک میں تیری سوتیلی ماں ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس حسین ساحرہ نے خیمے کا پردہ گرا دیا۔

اُس حسینہ کے ایک شانے پر زلفیں بکھری ہوئی تھیں دوسرے شانے پر شرابِ طہور کی سنہری صراحی تھی۔ وہ ہاتھ میں چاندی کا پیالہ لئے جنّت کی مخملیں گھاس پر خراماں خراماں چل رہی تھی۔ ٹھنڈی لطیف ہواؤں کے جھونکوں سے اس کا حریری لباس ایک طرف لہراتا تھا اور دوسری طرف اس کے شبابی بدن سے چپک جاتا تھا۔ اُسے دیکھ کر ایک تصوّراتی حُور کی زندہ تصویر مکمل ہو جاتی تھی۔

وہ ایک درخت کے سائے میں تھک کر بیٹھ گئی حالانکہ جنّت کی فضاؤں میں تھکن غالب نہیں آتی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ جنّت نہیں جہنّم ہے ہم جیسی حُور و غلمان کے لئے ایک قید خانہ ہے۔ ہم شیخ الجبل کی اجازت کے بغیر اس

جنت سے باہر نہیں جا سکتے اپنی مرضی کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتے۔ ہم اچھا کھانے اور اچھا پہننے والے قیدی ہیں۔

یہاں کی ایک حور نے مجھے بتایا ہے کہ اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے حسن بن صباح نے یہ جنت بنائی تھی۔ ہمارا موجودہ شیخ الجبل ۔۔۔ علاؤالدین محمد ہے، وہ حسن بن صباح کا چھٹا جانشین ہے۔ پتہ نہیں ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں کتنی حوریں اور غلمان یہاں قیدی بن کر آتے تھے اور یہاں سے پھر کس دنیا میں چلے گئے۔ اُن کے انجام کی خبر صرف شیخ الجبل کو ہے۔ مجھے تو اپنے انجام کی فکر ہے۔ جب میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔ جب میرا انگ انگ ماند پڑ جائے گا اور میرے بدن کا ہر تار ڈھیلا ہو جائے گا۔ تب میرا کیا بنے گا؟ یہ حور بوڑھی ہو کر تو جنت میں نہیں رہے گی مجھے کہاں پھینک دیا جائے گا؟

یہ میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ مجھے انسانوں کی دنیا میں واپس جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ محض اس ڈر سے کہ کہیں میں اس فریبی جنت کی حقیقت نہ کھول دوں۔ لیکن میں یہاں سے واپس جاؤں گی۔ اس جنت میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔

وہ سوچتی رہتی تھی اور وہاں سے فرار ہونے کے منصوبے بناتی رہتی تھی۔ اس کی سوچ کے دوران ایک غلام لڑکا درخت کے سائے میں آ گیا۔ وہ اپنے خیال میں محو تھی۔ لڑکے نے کہا۔

"صرف سوچنے سے راستہ نہیں ملتا۔ تم کئی بار میرے سامنے فرار

ہونے کا فر کہہ کر چکی ہو۔ یہ بات شیخ الجبل تک پہنچے گی تو وہ بڑی عبرتناک سزا ایسی دے گا۔"

اُس حسینہ نے خوبصورت لڑکے کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "میں سزا سے نہیں ڈرتی۔ اچھا ہے کہ وہ مجھے فرار ہونے کے جرم میں مار ڈالیں مگر افسوس اس جنت سے فرار ہونے کا بس ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ ایک تہہ خانے سے ہو کر شیخ الجبل کے حجرے سے گزرتا ہے۔"

ایک راستہ اور ہے۔ یہ جو اونچی پہاڑیاں ہیں۔ ان کے دوسری طرف انسانوں کی دنیا ہے۔ میں نے ایک راستہ دریافت کیا ہے۔ ایک پگڈنڈی پہاڑی کی بلندی تک جاتی ہے۔ کیا تم اتنی بلندی تک چڑھ سکتی ہو؟"

"ہاں۔ میں اس بلندی تک جا سکتی ہوں۔ اگر نہ جا سکی تو وہیں سے نیچے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لوں گی۔ تم مجھے راستہ دکھا دو۔ رات کا وقت ہے میں پہریداروں کی نظریں بچا کر یہاں سے نکل جاؤں گی۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ تم دیکھ رہی ہو کہ اب میری مسیں بھیگنے لگی ہیں۔ چہرے پر داڑھی اور مونچھوں کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔ جب میرے چہرے پر چکنا ہٹ نہیں رہے گی اور میرا جسم جوان مردوں کی طرح ٹھوس ہوتا جائے گا تو پھر شیخ الجبل مجھے غلمان کی فہرست سے نکال دے گا۔ پتہ نہیں یہاں سے نکال کر مجھے کس جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہی مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔"

وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے جنت میں کبھی رات نہیں ہوتی مگر زمین پر جنت بنانے والے

رات کی تاریکی کو غالب آنے سے نہیں روک سکتے تھے۔ دُور دُور تک قندیلیں روشن کی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود جنّت کا حُسن قائم نہیں رہتا تھا۔ جگہ جگہ تاریک رات کے دھبّے نظر آتے تھے۔ وہ دونوں ان دھبّوں میں چھپتے ہوئے پہاڑی پگڈنڈی کی طرف جا رہے تھے۔

وہاں سے فرار ہونا اتنا آسان نہ تھا، جتنا کہ وہ سوچ رہے تھے۔ شیخ الجبل نے پہاڑوں کی بلندیوں پر دور دور تک فدائیوں کا پہرہ بٹھا دیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے دنوں جنّت میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس کی وہ کبھی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ جنّت میں چوری ہو گئی تھی۔ سونے کے ڈھیلے اور ہیرے جواہرات ایک پہاڑی سُرنگ میں جمع کیے جاتے تھے۔ اس سُرنگ تک پہنچنے کے لئے جنّت میں داخل ہونا ضروری تھا۔ شیخ الجبل کے چند خاص آدمیوں کے سوا جنّت تک پہنچنے کا راستہ کوئی نہیں جانتا تھا اور وہ خاص آدمی اپنے شیخ کے اتنے وفادار اور جاں نثار تھے کہ وہ اُس مقدس خزانے کو ہاتھ لگانے کے بجائے مر جانا بہتر سمجھتے تھے۔ سُرنگ کے دہانے پر دن رات تین فدائیوں کے پہرے بدلتے تھے تاکہ حور و غلمان کے فرائض ادا کرنے والی لڑکیاں اور لڑکے بھی اُس خزانے کو ہاتھ نہ لگا سکیں۔ اتنی حفاظت کے باوجود رات کو پہرہ دینے والا فدائی صبح سُرنگ کے سامنے مردہ پایا گیا۔ خزانہ اتنا تھا کہ کئی اونٹوں پر لاد کر لے جایا جا سکتا تھا مگر کوئی اپنی ضرورت کے مطابق ہیرے جواہرات لے گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو خچر پر لاد کر لے گیا ہوگا۔ اتنی چوری کے باوجود خزانے میں کمی کا احساس نہ ہوتا۔ لیکن خزانے کا

مال ستم رنگ کے دہانے تک اس طرح بکھرا ہوا تھا کہ چوری کا علم ہو گیا۔ چور کوئی بھی تھا وہ رنگین مزاج بھی تھا۔ کیونکہ جنت کی ایک حور کو بھی اٹھا لے گیا تھا۔

شیخ الجبال علاؤ الدین محمد کے معتمد خاص نے پہلے یہ سمجھا کہ غائب ہو جانے والی حور مال چرا کر لے گئی ہے۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ حور کے بازوؤں میں اتنی قوت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ہٹے کٹے فدائی کو قتل کر دیتی اور تن تنہا پہاڑ کی بلندی سر کر کے انہیں چرکا دے جاتی۔ بہر حال جب چوری کا پتہ نہ چلا تو پہاڑیوں کی بلندیوں پر دور دور تک فدائیوں کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ شیخ الجبال نے حکم دیا تھا کہ وہ جیالا رنگین مزاج چور ہاتھ آ جائے تو اسے قتل نہ کیا جائے بلکہ زندہ الموت کے قلعے میں لایا جائے۔

ان حالات میں وہ حور اور غلام لڑکا پہاڑی کی پگڈنڈی پر سنبھلتے سنبھلتے بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ یقینی بات تھی کہ فدائیوں سے ان کا سامنا ہو جاتا لہٰذا سامنا ہو ہی گیا۔ بلندی پر پہنچتے ہی تین فدائیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ایک نے گرج کر پوچھا "کون ہو تم؟"

"شجرہ" حور نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "میرا نام شجرۃ الدر ہے۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے یہاں سے چپ چاپ چلا جانے دو۔ میں کسی کے سامنے جنت کے اس راستے کا ذکر نہیں کروں گی"

"تم یہاں سے جانا چاہتی ہو۔ سیدنا شیخ الجبل تمہیں ہمیشہ کے لئے یہاں سے ضرور بھیج دیں گے۔ چلو، خود کو ہمارے حوالے کر دو"

وہ حور صفت دوشیزہ سہم کر پیچھے ہٹنے لگی "نہیں، میں اس پہاڑی سے

مگر کر جان دے دوں گی۔ لیکن شیخ الجبل کے سامنے نہیں جاؤں گی۔"

وہ سہمے ہوئے قدموں سے ایک اونچی چٹان کی طرف بڑھنے لگی تینوں فدائی اُسے گھیرنے لگے اتنے میں انہیں اپنے پیچھے کسی شخص کی کراہیں سنائی دیں۔

"آہ! اتنا بوجھ تو ایک خچر بھی نہیں اُٹھا سکے گا۔ یہ دولت بہت بڑی چیز ہے۔ مجھ جیسے شریف آدمی کو چور بنا دیتی ہے۔ بھائیو! فدائیو! خدا میری مدد کرو۔ اپنے شیخ الجبل کی یہ دولت میرے خچر تک پہنچا دو۔"

تینوں فدائی اس حُور کو بھول کر اُسے دیکھنے لگے۔ وہ اپنی پشت پر سے دو بڑی اور بھاری بھرکم گٹھریاں اُتار رہا تھا۔ اندھیرے میں اُس کا چہرہ واضح نہیں تھا۔ لیکن اس کے ڈیل ڈول سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کافی صحت مند اور تگڑا آدمی ہے۔ وہ بھاری بھرکم گٹھریاں بتا رہی تھیں کہ وہ بہت زیادہ وزن اٹھا کر اتنی بلندی پر چڑھتا آ رہا ہے اور جس انداز میں وہ فدائیوں سے مدد طلب کر رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ بے باک اور مسخرہ بھی ہے۔

ایک فدائی نے غصے سے کہا "اچھا تو تم وہی چور ہو جس کی ہمیں تلاش ہے۔ آج تمہاری موت تمہیں یہاں لے آئی ہے۔"

چور نے کہا "تم مجھے مار کر کیا کرو گے۔ میں تو جیتے جی تمہاری جنت میں جا کر چلا آتا ہوں اور بقدر ضرورت ایک آدھ حُور کو بھی لے کر چلا جاتا ہوں۔ ابھی یہ ہیرے جواہرات اُٹھا کر میں نے سوچا کہ آج بھی ایک حُور کو ساتھ لے چلوں مگر اس سلسلے میں تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔ میں نے جنت میں ہی اس شجرۃ الدر نامی حُور کو دیکھ لیا تھا۔ یہ خود ہی اوپر چلی آ رہی تھی۔ کاش کہ شیخ الجبل کی تمام

دولت بھی خود بخود اوپر آجاتے۔ بہر حال تم تینوں اس کے آدمی ہو۔ اس دولت کو ذرا نیچے پہاڑی کے دامن تک پہنچا دو۔ میں نیچے پہنچ کر اس نیکی کے بدلے تم تینوں کو ہمیشہ کے لیئے جنّت میں پہنچا دوں گا۔"

تینوں فدائی غصّے میں اس کی طرف دوڑ ے۔ چور نے ایک گٹھری اُٹھا کر ایک فدائی پر پھینکی۔ گٹھری اتنی وزنی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ پہاڑی کے نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ دوسری گٹھری دوسرے پر آئی۔ اس کا بھی یہی انجام ہوا۔ وہ دونوں گٹھریوں سمیت دور پستی کی طرف اندھیرے میں لڑھکتے جارہے تھے تھوڑی دیر تک اُن کی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر وہ اندھیرے کی گود میں گم ہو گئے۔

تیسرا فدائی تنہا رہ گیا تھا۔ اُس نے اپنی آستین سے زہریلا خنجر نکال لیا۔ شیخ الجبل نے حکم دیا تھا کہ چور کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ لیکن اب وہ فدائی اُسے زہریلے خنجر سے ہلاک کر سکتا تھا۔ تنہا اسے گرفتار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ چور بہت ہی چالاک تھا، ہاتھا پائی کیئے بغیر دو فدائیوں کو پہاڑ کی بلندی سے گرا چکا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں کہ شیخ الجبل کے فدائی اپنی آستینوں میں زہریلے خنجر چھپا کر رکھتے ہیں۔ اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ پہلے ہی حملے میں مجھے ہلاک کر دو۔ اگر ناکام ہوئے تو یہ خنجر تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ چلو شروع ہو جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دل میں خنجر آزمائی کی حسرت رہ جائے۔"

وہ اتنی بے باکی سے مضحکہ خیز انداز میں کہہ رہا تھا کہ فدائی کا ذہن اُلجھ گیا۔ ایک نہتا شخص کس طرح زہریلے خنجر سے اپنا بچاؤ کرے گا۔ یہ بات وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ اُس چور نے حور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے خبردار! اس بیچارے کو پتھر سے نہ مارنا۔۔۔"

فدائی نے فوراً ہی سر گھما کر حور کی جانب دیکھا۔ اُسی لمحے اس کے خنجر والے ہاتھ پر ایک ٹھوکر لگی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔ چور نے کہا۔

"میں نے سنا تھا کہ فدائیوں کو لڑنے مرنے کی بہترین تربیت دی جاتی ہے۔ مگر تم خنجر پکڑے یوں سوچ رہے تھے جیسے کوئی حسینہ ہاتھ میں گلاب کا پھول لئے سوچ رہی ہو۔"

فدائی نے غصے، جوش اور جنون میں اُس پر چھلانگ لگا دی۔ چور اس سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہ اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فدائی اوندھے منہ پتھریلی زمین پر گر پڑا۔ سنگلاخ زمین پر اتنی سخت چوٹیں آئیں کہ فوراً ہی اٹھ نہ سکا۔ جب اٹھنے کی کوشش کی تو ایک ٹھوکر نے اسے پھر زمین پر لُڑھکا دیا وہ ٹھوکریں کھا کر زخمی درندے کی طرح غرّانے لگا۔

شجرہ بڑی حیرانی سے اُس رحمت کے فرشتے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس انداز سے لڑ رہا تھا کہ فدائی کو اب تک حملہ کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ اس کے حملہ کرنے سے پہلے ہی وہ جوابی حملہ کر دیتا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ زمین پر لیٹے ہی لیٹے کراہنے لگا۔ اب اس میں اُٹھنے کی بھی سکت نہیں

تھی ۔ چمد نے کہا ۔

"میں نے حکم دیا تھا کہ اپنے شیخ کی دولت نیچے وادی تک پہنچا دو ۔ میں جو حکم دیتا ہوں، ہر حال میں اس کی تعمیل کرنی پڑتی ہے ۔ تمہارے دونوں ساتھی اس دولت کو پہنچانے نیچے چلے گئے ہیں، اب تم بھی جاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے فدائی کو اُٹھایا ۔ جوان فدائی وزن میں تقریباً اس کے برابر تھا ۔ مگر وہ نوشاید جناتی قوتوں کا مالک تھا ۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اُسے اٹھا کر اپنے سر سے بلند کر لیا اور یہ کہتے ہوئے اُسے نیچے پھینک دیا "اب اپنے شیخ کی جنت سے نکل کر جہنم میں جاؤ ۔ ۔ ۔"

چند لمحات تک پستی کے اندھیرے میں اُس کی چیخیں سنائی دیتی رہیں ۔ پھر وہ چیخیں جہنم کی تاریکی میں ڈوب گئیں اور گہرا سناٹا چھا گیا ۔ شجرہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان کی گہری سانس لی ۔ پھر اُس کی طرف بڑھتی ہوئی بولی ۔

"تو واقعی دلیر ہے ۔ اگر تو نہ ہوتا تو یہ فدائی مجھے شیخ الجبل کے پاس لے جاتے ۔ پھر نہ جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ۔"

"یہ احمق لوگ نہیں جانتے کہ حسین عورت کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے" اس نے شجرہ کے قریب آ کر اُس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر کہا ۔ "میں جانتا ہوں کہ ایک حسین عورت کے ساتھ کیسا حسین سلوک کرنا چاہئے ۔ لیکن اس اندھیرے میں یا ستاروں کی اندھی روشنی میں یہ اندازہ نہیں ہو رہا ہے تو کتنی حسین ہے ۔ تیری آواز کی شیرینی بتاتی ہے کہ تو شہد سے تراشی گئی ہے ۔ آ، میں تجھے چھو کر اندازہ کروں ۔"

وہ اسے جگہ جگہ سے چھونے لگا۔ ایک اندھے کی طرح انگلیوں سے ٹٹولنے لگا۔ شجرہ سہمی ہوئی تھی۔ فدائیوں سے نجات پا کر ایک چور کے شکنجے میں پھنس گئی تھی۔ گویا آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئی تھی۔ لیکن اس کھجور میں مٹھاس تھی۔ زندگی میں پہلی بار ایک اجنبی کے بازوؤں نے اُسے قید کیا تھا۔ اس لئے مٹھاس کے باوجود خوف بھی تھا۔

وہ جوانی کے اُس سفر کے پہلے ہمسفر کا چہرہ دیکھنا اور پہچاننا چاہتی تھی مگر اندھیرا اُسے چھپا رہا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ کہیں کہیں سے جھلک رہا تھا۔ سر پر بندھی ہوئی پگڑی پیشانی تک آ گئی تھی۔ پگڑی کا ایک پلہ اُس کی ایک آنکھ کو چھپا رہا تھا۔ شاید اُس آنکھ میں کوئی عیب تھا اس لیے وہ دانستہ چھپائی گئی تھی۔ بہرحال وہ جیسا بھی تھا مہربان تھا وہ اسے با حفاظت یہاں سے لے جا سکتا تھا۔ وہ فولادی بازوؤں میں کسمساتی ہوئی بولی۔

"یہاں پھر کوئی آ جائے گا۔ ہمیں فوراً کہیں دور نکل جانا چاہئے۔"

اس نے قہقہہ لگا کر کہا "میرے راستے میں دریا بھی آتے ہیں تو مجھے دیکھ کر اپنے بہنے کا راستہ بدل دیتے ہیں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ خوف کا دوسرا نام بزدلی ہے۔ ویسے تو ایک عورت ہے۔ تیرا بزدل ہونا لازمی ہے۔ اگر یہ بزدلی نہ ہو تو حسین عورت کبھی مرد کی بانہوں میں پناہ نہ لے پائے، یہ کتنی خوبصورت بزدلی ہے۔"

وہ اُسے چومنے لگا۔ شجرہ نے کہا۔ "ہاں، میں تیری پناہ میں آ گئی ہوں۔"

میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ دوست ایک بھی نہیں ہے، دشمن ہزاروں ہیں۔ تو مجھے جہاں بھی ہانک کر لے جائے گا" میں چلی جاؤں گی۔ چل مجھے یہاں سے ابھی لے چل۔ خدا کے لیئے یہاں ٹھہرنے کی ضد نہ کر"

اُس نے شجرہ کی بات مان لی۔ اُس کا ہاتھ تھام کر نشیب میں اُترنے لگا۔ غلام لڑکا لڑائی جھگڑے کے دوران موقع سے فائدہ اُٹھا کر بھاگ گیا تھا۔ شجرہ نے اُسے دو چار آوازیں دیں لیکن جواب نہ ملا۔ پھر وہ خاموشی سے اُس چور کے سہارے سنبھل سنبھل کر پہاڑی سے اُترنے لگی۔ راستے میں ایک فدائی کی لاش نظر آئی۔ وہ دو چٹانوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا اور اُس سے ذرا دور ہیرے جواہرات کی گٹھڑی کا کپڑا پھٹ کر چیتھڑوں میں بدل گیا تھا۔ تمام ہیرے جواہرات دور دور تک بکھر گئے تھے۔ اس چور کی نظریں بہت تیز تھیں۔ وہ اندھیرے میں دور تک دیکھ لیتا تھا۔ اُس نے شجرہ کے لباس کو تھام کر ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"اسے اُتار دے ....."

وہ گھبرا کر بولی "نہیں، یہ کیا حرکت ہے۔ میں یہاں لباس نہیں اُتاروں گی"۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا "ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی ہو۔ کیا تو نہیں دیکھ رہی ہے کہ چوری کا تمام مال بکھر گیا ہے۔ گٹھڑی پھٹ گئی ہے۔ چوری کا مال ہمیشہ باندھ کر لے جانا پڑتا ہے حالانکہ تو بھی چوری کا مال ہے۔ لیکن ایسا مال ہے جسے رات کی تاریکی میں کھول دیا جاتا ہے"

رہ بکھرے ہوئے ماں کو باندھنے کے لئے، سہمے اور سمٹے ہوئے ماں کی حسین گٹھری کو ٹٹولنے لگا۔ شجرہ نے سہم کر کہا "تو بھی عجیب انسان ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر تو کون ہے؟"

اس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"ابھی تو میں ایک چور ہوں۔ لیکن بہت جلد ایک ناقابلِ تسخیر بے تاج کا بادشاہ کہلاؤں گا۔ تاریخ کے صفحات پر میرا نام جلی حرفوں میں لکھا جائے گا۔ اس وقت تک میں خاموش، گمنام اور پُر اسرار انسان بن کر رہنا چاہتا ہوں لہٰذا تو مجھ سے میرا نام نہ پوچھ ....."

اتنا کہہ کر اس نے اس حسین گٹھری کو سر تا پا کھول دیا۔

چنگیز خاں کے تمام بیٹے اور پوتے ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں ہلاکو خاں بھی تھا۔ ان کے موجودہ خاقان کا نام اوغدائی تھا وہ چنگیز خاں کا تیسرا بیٹا اور ہلاکو خاں کا چچا تھا۔ اُس وقت اوغدائی اپنے خیمے کے اندر بیمار پڑا تھا۔ دستور کے مطابق اس کے خیمے پر مہر لگادی گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی اندر نہ جاتے۔ اُن کے عقیدے کے مطابق بیمار خاقان اوغدائی کے جسم میں بری روحیں گھس گئی تھیں۔ جنہیں نکال بھگانے کے لئے اُن کا شامان منتر اور دعائیں پڑھ رہا تھا۔

اگر کسی سلطنت کا حاکم بیمار ہو تو اس کے جانشین اور دوسرے عہدیدار اس کی جگہ حاصل کرنے کے لئے سیاسی چالبازیاں شروع کر دیتے ہیں

مگر اُس قبیلے میں کسی کو خاقان بننے کا لالچ نہیں تھا۔ سب ہی اوغدائی کی صحت یابی اور درازیٔ عمر کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

بیمار خاقان کا چھوٹا بھائی تولوئی جو ہلاکو کا باپ تھا اور ہلاکو کی حسین محبوبہ کا خاوند تھا، اس کی آنکھوں سے زیادہ آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اپنے بھائی خاقان اوغدائی سے بیحد محبت کرتا تھا۔ قبیلے کے تمام لوگ جانتے تھے کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ تولوئی اپنے بھائی کی بیماری سے پریشان ہو کر شراب پی رہا تھا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر اس کی صحت یابی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

اُس کی حسین بیوی دوقوزہ اس کے شراب کے پیالے کو تھامے کھڑی تھی۔ جب تولوئی دُعا مانگ کر ہاتھ نیچے گرا دیتا تو وہ شراب کا پیالہ اس کی طرف بڑھا دیتی۔ تولوئی دو گھونٹ پیتا، پیالہ اُسے واپس کرتا، پھر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر گڑگڑانے لگتا۔ اس کے ایک جانب دوقوزہ کھڑی ہوئی تھی۔ دوسری جانب راہب ولیم تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

راہب ولیم کی نظریں دوقوزہ سے کہہ رہی تھیں "یہ تیرا بوڑھا خاوند تیرے انتظار کرتے رہنے سے نہیں مرے گا، اسے مارنا ہوگا۔ یہ اچھا موقعہ ہے تمام لوگ خاقان کے لئے غم زدہ ہیں اور سر جھکائے کھڑے ہیں۔ تیرے ہاتھ میں شراب کا پیالہ ہے اور یہ شراب تیرا بوڑھا خاوند پی رہا ہے۔

اس پیالے میں ایک چٹکی زہر گھول دے۔ کسی کو خبر نہ ہوگی اور اس بوڑھے سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔"

وہ قوزہ کی نظریں راہب ولیم سے کہہ رہی تھیں۔ "وہ جوانی کی دھوپ، بوڑھے برگد کے سائے میں نہیں رہتی۔ میں بھی اس کے سائے میں نہیں رہنا چاہتی۔ لیکن شراب زہریلی ہو جائے گی تو سب ہی مجھ پر شبہ کریں گے۔ ہلاکو بھی یہ نہیں چاہتا کہ میں اس کے باپ سے دشمنی کروں۔ اگر اسے میری دشمنی کا علم ہوگیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ میرا دشمن بن جائے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھ سے بدظن ہو جائے۔ مجھے ایسے موقع کا انتظار کرنا چاہیئے، جب سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ اور ایسا موقع ضرور ہاتھ آئے گا۔"

وہ کن انکھیوں سے ہلاکو کو دیکھنے لگی۔ ہلاکو بھی رہ رہ کر اسے چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی ضرورت سمجھ کر دیکھنے پر مجبور تھے۔ اس وقت شامان آسمان کی طرف منہ اٹھائے منتر پڑھ رہا تھا۔ سب لوگوں کو قوی امید تھی کہ شامان اپنی جادوگری یا جڑی بوٹیوں سے خاقان اوغدائی کے جسم سے منحوس روحوں کو نکال دے گا اس لئے سب ہی اسے پر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

شامان منتر پڑھتے پڑھتے اچانک ہی خاموش ہوگیا۔ اس کا منہ اب تک آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اس کا بدن یوں ساکت ہوگیا تھا جیسے لکڑی کا خاموش پتلا کھڑا ہو۔ سب نے سمجھ لیا کہ شامان کی روح اس کے جسم سے نکل کر آسمان تک گئی ہے اور وہاں "مونگ کے تینگری" سے صلاح مشورے

کرنے کے بعد واپس آئے گی۔

تمام لوگ بے چینی سے انتظار کرنے لگے کہ دیکھو آسمان سے کیا خبر آتی ہے۔ دو قوزہ اور راہب ولیم شامان کی ساحری اور چالبازی کو سمجھتے تھے کہ وہ حبسِ دم کا ماہر ہے۔ سانس روکے کھڑا تھا۔ اس کی ظاہری حالت سے واقعی ایسا لگتا تھا جیسے روح جسم کو چھوڑ چکی ہو۔ وہ دونوں طبیعاتی یہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ اس کی روح آسمان پر کسی سے باتیں کرنے گئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد شامان پھر سانس لینے لگا۔ اُس نے پلٹ کر چنگیز خاں کی پرانی اور نئی نسل کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ کیونکہ وہ جلالی آسمان سے باتیں کرتا رہا تھا۔ تمام لوگ اس سے مرعوب تھے۔ اس نے گونجتی گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مونگ کے تینگری، ہمارا جلالی آسمان ہم سے ناراض ہے۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میری روح نے بار بار سجدے کئے اور خاقان اوغدائی کی زندگی کی بھیک مانگتی رہی۔ روح کا سجدہ خالی نہیں جاتا۔ جلالی آسمان نے کہا ہے کہ موت بھوکی ہے اور کسی ایک کی زندگی کو کھانا چاہتی ہے۔ اسی لئے خاقان کے جسم سے آسیب چمٹ گئے ہیں۔ اب ضروری ہے کہ خاقان کے جسم کو دھو کر ان آسیبوں کو نکالا جائے۔ یہ بیماری کسی دوسرے کی طرف جائے گی تو خاقان صحت یاب ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے حکم دیا کہ چشمے سے تازہ پانی لایا جائے۔ اس سلسلے میں سات کنواریاں طلب کی گئیں۔ ان سے کہا گیا کہ وہ چیتھڑے کے نازک، نازک

پودوں سے بیمار کے خیمے میں جھاڑو دیں تاکہ کسی طرح کی گندگی باقی نہ رہے وہ سب شاماں کے حکم کے مطابق عمل کر رہے تھے۔ انہوں نے لکڑی کی ایک ہانڈی میں چشمے کا پانی لیا، اس میں شراب اور بکری کا دودھ اُنڈیلا پھر اُسے اُپلوں کی آگ پر جوش دینے لگے۔ اس دوران شاماں منتر پڑھتا رہا۔ جب پانی، شراب اور دودھ کا مرکب تیار ہو گیا تو وہ لکڑی کی ہانڈی خیمے میں بھیج دی گئی۔ شاماں کی ہدایت کے مطابق سات کنواریاں اس مرکب سے خاقان اوغدائی کے جسم کے بیمار حصّوں کو دھونے لگیں۔ وہ پانی اُن حصّوں کی صفائی کرتا ہوا ایک بڑے سے لکڑی کے پیالے میں گرتا جارہا تھا۔

خیمے کے باہر کھڑے ہوئے تولوئی خاں نے زیرِ لب کہا، "میں اپنے بھائی اوغدائی کی بیماری پی لوں گا۔"

اُس کے قریب کھڑی ہوئی دوقوزہ نے اس کی بات سُن لی۔ اُس نے پوچھا "تولوئی میرے سرتاج! تو کیا کہہ رہا ہے۔ بیماری پینے کا مطلب کیا ہوا؟"

اس نے شراب کے دو گھونٹ پینے کے بعد جواب دیا۔ "میں وہ مرکب نوش کروں گا جو اوغدائی کے بیمار جسم سے گزر کر آئے گا۔ پھر وہ بیماری میرے جسم میں منتقل ہو جائے گی اور میرا بھائی صحت یاب ہو جائے گا۔"

دوقوزہ نے ایک جان نچھاور کرنے والی بیوی کی محبت کا اظہار کیا۔ "اگر تو مر گیا تو میرا کیا ہوگا؟"

"تو جوان ہے، حسین ہے۔ میرے قبیلے کے کتنے ہی معزز لوگ تجھے اپنے حرم میں رکھنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ تو اپنی فکر نہ کر، مجھے اپنے بھائی

کی فکر کرنے دے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ چند قدم آگے بڑھ گیا اور خیمے کی طرف دیکھتے ہوئے اُس مرکب کا انتظار کرنے لگا، جو ابھی باہر لایا جانے والا تھا۔ راہب وہیم نے دوقوزہ کے قریب آکر آہستگی سے کہا۔

"کیا اس سے بہتر موقع تجھے ملے گا؟"

"ہاں یہ موقعہ بہتر ہے۔ میں ابھی کوشش کرتی ہوں۔"

اتنے میں سات کنواریاں خیمے سے باہر آگئیں۔ ایک کنواری کے ہاتھ میں لکڑی کا وہ بڑا سا پیالہ تھا جس میں چشمے کا پانی، شراب اور بکری کا دودھ تھا اور اب اُس مرکب میں بیمار جسم کے جراثیم یا آسیب حل ہو گئے تھے۔

دوقوزہ نے آگے بڑھ کر وہ پیالہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ پھر وہ قبیلے کے بوڑھے سرداروں، چنگیز خان کے بیٹوں اور پوتوں کے قریب سے گزرتی ہوئی بولی۔

"تولوئی خاں میرا خاوند اور میری زندگی کا محافظ ہے مگر اب یہ اپنے بھائی خاقان کا محافظ بن کر اُس کی بیماری پی لینا چاہتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ تولوئی خاں اپنے خاقان کا سب سے عزیز بھائی ہے اور فرماں بردار خادم بھی ہے۔ آج یہ اپنے خاقان پر اپنی جان قربان کرنا چاہتا ہے۔

لیکن اس کے بعد میری زندگی کا محافظ کون ہوگا؟ میں اس کی بیوی کی حیثیت سے اعتراض کر سکتی ہوں کہ یہ اتنی بڑی قربانی نہ دے مگر اس قبیلے کے دستور کے مطابق اسے یہ اہم فرض ادا کرنے سے نہیں روک سکتی۔ کیا اس

قبیلے کا کوئی فرد تولوئی کو اس مقدس فرض کی ادائیگی سے روک سکتا ہے ؟"

وہ باری باری ہر ایک کے سامنے سے گزرتی ہوئی ہلاکو خاں کے سامنے آ کھڑی ہو گئی۔ ہلاکو اُس حسینہ کا دیوانہ تھا۔ اس کی خاطر وہ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک قتل و غارت گری کا بازار گرم کر سکتا تھا۔ لیکن اپنے باپ کو ہلاک کرنے کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خود کو قربانی کے لئے پیش کر سکتا تھا۔ چنگیز خاں کا کوئی بھی بیٹا یا پوتا اپنے خاقان کی بیماری پی سکتا تھا۔ لیکن بیماری پینے کا اچھوتا خیال سب سے پہلے تولوئی کے دماغ میں آیا تھا اور سب سے پہلے اُسی نے خود کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا اس لئے اب کوئی بھائی یا بیٹا خود کو پیش کر کے اس کی توہین نہیں کر سکتا تھا۔

اسی لئے جب دوقیزہ پیالہ لے کر ہلاکو کے سامنے آئی تو اُس نے بے بسی سے سر کو جھکا لیا۔ اُس وقت اسے اپنے باپ کی عظمت کا احساس ہوا۔ وہ بھائی کی محبت میں موت کو پی رہا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی اس کے بیٹے کے حصے میں آئے گی۔

دوقوزہ نے پھر ایک بار تمام لوگوں کو مخاطب کیا۔ "تولوئی خاں کہتا ہے کہ اگر اس کی قربانی قبول ہو گئی اور اگر وہ مر گیا تو اس قبیلے کا کوئی معزز شخص مجھے اپنے حرم میں پناہ دے گا۔ لیکن میں تولوئی خاں کی زندگی میں فیصلہ کرنا چاہتی ہوں کہ کسی بھی شخص کا انتخاب میں اپنی مرضی سے کروں گی۔"

تولوئی نے کہا۔ "مجھے تیرا فیصلہ منظور ہے۔ میرے بعد تو آزاد اور

خود مختار ہوگی۔ اب دیر نہ کر، وہ پیالہ مجھے دے دے۔"

دوقوزہ نے معنی خیز نظروں سے ہلاکو خاں کو دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس حسینہ نے وہاں سے پلٹتے وقت اپنی انگلی میں پہنی ہوئی ہاتھی دانت کی انگوٹھی کو پیالے کے رقیق مرکب میں ڈبو دیا۔ انگوٹھی سے ایک چٹکی زہر نکل کر اس مرکب میں حل ہونے لگا۔ پھر اُس نے آگے بڑھ کر وہ پیالہ اپنے بوڑھے خاوند کے ہاتھوں میں دیدیا۔

تولوئی نے پیالے کو ہاتھوں میں تھام کر آسمان کی طرف سر اُٹھایا اور عاجزی سے کہا۔

"اے خداوند بزرگ و جاہ دار! اگر موت بھوکی ہے اور کسی ایک کی زندگی کو کھانا چاہتی ہے تو اسے میری طرف لگا دے۔

اے قہر و غضب والے! اگر تو گناہوں کی سزا دے رہا ہے تو میرا نامۂ اعمال میرے بھائی سے زیادہ سیاہ ہے۔ لڑائیوں میں، میں نے اُس سے زیادہ آدمیوں کی جان لی ہے اور لوگوں کے بال بچے چھینے ہیں اور قیدیوں کے ماں باپ کو رُلایا ہے۔

اے حُسن و عقل دینے والے! اگر تیری مرضی یہ ہے کہ اپنے حضور ایک خوبرو اور عاقل خادم کو طلب کرے، تب بھی مجھے بلا کیونکہ میں اپنے بھائی سے زیادہ خوبرو و عاقل ہوں۔

اے مونگکے تینگری! تو منحوس روحوں اور آسیبوں کا حاکم ہے جو آسیب میرے بھائی کے جسم سے چمٹے ہوتے تھے میں انہیں پی رہا ہوں اس لئے او خدائی کے بجائے میری جان لے، اُس کی بیماری مجھے دے اور اسے اس مرض الموت سے نجات دے۔"

اس نے بڑے عجز سے یہ دُعا مانگی۔ پھر اُس موت کے جام کو ہونٹوں سے لگا کر غٹا غٹ پینے لگا۔ تمام لوگ یوں خاموش تھے جیسے سانس روکے کھڑے ہوں۔ وہ آسمان کی جانب بھی دیکھ رہے تھے اور کسی معجزے کے منتظر تھے۔

تولوئی نے پیالہ خالی کر کے اُسے ایک طرف پھینک دیا۔ پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا بیمار بھائی کے خیمے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس خیمے پر مُہر لگی تھی کہ کوئی نہ آئے مگر اب وہ جا سکتا تھا کیونکہ اس نے بیماری کا جام پی لیا تھا۔ لیکن وہ خیمے میں داخل ہونے سے پہلے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اُس کے چاروں بیٹے دوڑتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ تولوئی نے دم توڑتے ہوئے پہلے بیٹے منگو خاں کو دیکھا۔ پھر دوسرے بیٹے قبلائی خاں پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد تیسرے بیٹے ہلاکو خاں کو دیکھتے ہی مسکرا کر آخری ہچکی لی اور چوتھے بیٹے اریق بوغا کو دیکھنے سے پہلے ہی ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

جب اس کی موت کی تصدیق ہو گئی تو شامان نے قبیلے والوں سے بڑے فخر سے کہا۔

"میری عبادت سچی نکلی۔ میری روح نے پہلے ہی آسمان پر جا کر موتگ کے تنگری سے معاملہ طے کر لیا تھا۔ اسے ایک زندگی کی ضرورت تھی اور تولوئی نے یہ ضرورت پوری کر دی ہے۔"

دو قوندہ نے ہلاکو خاں کے قریب آ کر کہا "تیرا باپ ایک عظیم انسان تھا۔ اُس نے خاقان کے حصے کی موت کو اپنے گلے لگا لیا۔ میں تیرے غم میں

برابر کی شریک ہوں۔"

ہلاکو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ماتم کے دوران اس حسینہ کی نرم گرم ہتھیلی اسے سکون پہنچا رہی تھی۔ اس وقت اس کی حالت عجیب سی تھی۔ باپ کی موت کا غم بھی تھا اور محبوبہ کو پا لینے کی چور خوشیاں بھی تھیں۔ وہ یقینی سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کون سا جذبہ صادق ہے، غم کا یا مسرت کا؟

بیمار اوغدائی رفتہ رفتہ صحت یاب ہونے لگا۔ یہ عقیدہ جڑ پکڑ گیا کہ تولوئی کی قربانی قبول ہو گئی ہے۔ اوغدائی بھی اپنے قربان ہونے والے بھائی سے بیحد محبت کرتا تھا۔ وہ اس کی موت کا غم غلط کرنے کے لئے پہلے سے زیادہ شراب پینے لگا۔ وہ ختائی نئی نئی شرابوں کا ذائقہ چکھتا تھا۔ جن میں لونگیں اور شکر ملی ہوتی تھیں۔ جب وہ پیتا تو برفیلی ہواؤں کا اثر ختم ہو جاتا۔ گرمی کی شدت سے خون اس کی کھوپڑی میں گردش کرنے لگتا وہ سر اٹھا کر تولوئی سے باتیں کرتا جو آسمان کے دروازے سے باہر چلا گیا تھا۔

شراب نوشی کی زیادتی نے ایک دن اُسے بھی موت کی نیند سلا دیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے قویوق کو خاقان بنایا گیا مگر وہ نااہل ثابت ہوا۔ آخر قربانی دینے والے تولوئی خاں کا بیٹا منگو خاں خاقان بن گیا۔

اس عرصے میں ہلاکو خاں دوقوزہ کے عشق میں مبتلا رہا۔ اس نے کئی بار اُسے بیوی بن کر رہنے پر مجبور کیا۔ مگر وہ مجبور ہونے والی نہ تھی وہ ہمیشہ اپنی شرط یاد دلا کر کہتی "یہ سمرقند سے مصر تک مسلمانوں کی حکومت ہے۔ وہاں عیسائی مذہب کی تشہیر ناممکن ہو گئی ہے۔ تو ناممکن کو ممکن بنا دے۔

مجھے اپنا وعدہ یاد ہے ۔ میں تجھے اُس بستر پر ملوں گی جو مسلمانوں کی کھالوں سے بنایا جائے گا۔ تجھ جیسے قصائی کے سامنے یہ کوئی بڑی شرط نہیں ہے ۔ تو ان رنگین لمحات کا تصور کر جب میں تیری آغوش میں آؤں گی۔ تجھے میری تمنا ہوگی تو جلد ہی اپنی فوج کے ساتھ یہاں سے کوچ کرے گا۔ میں ہر جگہ تیرے ساتھ رہوں گی ۔"

منگو خاں نے خاقان بننے کے بعد اپنا محل قراقرم میں بنوایا تھا۔ وہ مذہبی لڑائی نہیں لڑنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس پر عیسائیوں کا اثر تھا کیونکہ اُس کی ماں سیور قوطنی عیسائی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں دوقوزہ جو اب ہلاکو خاں کی محبوبہ تھی وہ بھی عیسائی تھی ہلاکو خاں کو جس مہم پر روانہ کر رہا تھا اس کا سپہ سالار خاص قطِ بوغا بھی عیسائی تھا۔ ان سب کے پیشِ نظر منگو خاں نے فیصلہ کیا کہ عیسائیوں کے تعصب سے فائدہ اُٹھائے اور اُن کی مدد سے اسلامی حکومتوں کو نیست و نابود کر دے۔

اُس نے ہلاکو خاں کو رخصت کرتے وقت نصیحت کی۔ "طاقت میں تم اور ذہانت میں دوقوزہ برتر ہے لہذا شہزادی دوقوزہ کی باتیں غور سے سنا کرو اور ان پر عمل کرتے رہو۔"

پھر اس نے حکم دیا۔ "حسن بن صباح کی جنت میں جاؤ اور اسے تباہ کر دو۔ ایک مسلمان ماہرِ نجوم نصیر الدین طوسی جو شیخ الجبل کی ملازمت کر رہا ہے، اسے ہمارے پاس بھیج دو۔ اس کے بعد ایران سے لے کر لبنان تک کوہستانوں کے سنگین قلعوں پر قبضہ جماؤ پھر مغرب کی طرف بڑھتے جاؤ اور اسلامی عسکری طاقت کے آخری قلعے مصر کو بھی تسخیر کر لو......"

منگو خاں کے حکم کے مطابق ہلاکو خاں اپنا تسلط جمانے کے لئے ایک بہت بڑی فوج لے کر روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ چینی انجینئروں کا دستہ تھا، جو سڑکیں بناتے اور دریاؤں پر پل تعمیر کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ایسے لوگ بھی تھے جو بارود کا استعمال جانتے تھے۔ جغرافیہ کے ماہرین بھی تھے جو نئے مفتوحہ علاقوں کے نقشے بناتے تھے۔ ہلاکو خاں نے پرانے دستور کے خلاف اپنی محبوبہ کو اپنے برابر بیٹھنے کا درجہ دیا۔ پھر بھی دوقوزہ نے اُسے ہاتھ پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ ایک منزل پر پہنچ کر ہلاکو خاں جھلا گیا۔ اس نے غصے سے کہا۔

"تو کیا سمجھتی ہے۔ کیا میں تیرا دیوانہ ہوں؟ تجھ سے زیادہ حسین عورتیں میری آغوش میں آسکتی ہیں۔"

"ہاں، تجھے ہزاروں حسین عورتیں مل جائیں گی۔ اس کے باوجود تیری آغوش میرے بدن کی حرارت سے محروم رہے گی۔ ساری دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھنے والے تو مجھے نہیں جیت سکتا۔"

اُس نے غرا کر کہا۔ "تو میری مردانگی کو للکار رہی ہے۔ کیا تو نہیں جانتی کہ میں کیسا درندہ ہوں؟ جو مجھے للکارتا ہے، میں اُسے بھنبھوڑ کر رکھ دیتا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں کہ تو درندہ ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ چنگیز خاں کی اولاد اپنے باپ اور بھائیوں سے دشمنی نہیں کرتی اور اُن کی بیویوں کی عزت کرتی ہے۔ جب تک میں تیری بیوی نہ بنوں، اُس وقت تک تیرے باپ کی بیوہ کہلاؤں گی۔ اس وقت تک میری عزت کرنا تجھ پر لازم ہے۔ کیا تو اپنے قبیلے کے دستور کے

خلاف مجھے ہاتھ لگا سکتا ہے ؟"

اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ وہ اس کے باپ کی بیوہ ہے، اُسے بیوی بنانے سے پہلے نہیں جیت سکتا اور نہ ہی کسی طرح کا ظلم کرنے کی دھمکی دے سکتا ہے قبیلے کے دستور کے مطابق اس کا احترام لازمی ہے۔

دوقوزہ نے اُسے نرم پڑتے دیکھ کر کہا "ہولاکو! غصے کی حالت میں یہ نہ بھول کہ میں تجھے دل و جان سے چاہتی ہوں۔ دیکھ، میں ہر مہم پر تیرے ساتھ ہوں اور ہمیشہ تیرے ساتھ رہوں گی۔ تیری جوانمردی اور حوصلوں کے پیشِ نظر میں نے ایک معمولی سی شرط رکھی ہے۔ تو یہی سمجھ لے کہ میں ایک ایسی زمین ہوں جس پر قبضہ جمانے اور حکومت کرنے سے پہلے مسلمانوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ میں ایک ایسا انعام ہوں، جسے پانے کے لیئے تو قہرِ آسمانی بن کر مسلمانوں پر ٹوٹے گا۔ لے میرا ہاتھ تھام لے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب بھی تو کسی ملک کو فتح کرے گا، میں تجھے ہر فتح کی خوشی میں ایک ننھے سے بوسے کا ننھا سا انعام دیا کروں گی۔"

دوقوزہ نے اُسے اپنا ہاتھ پیش کیا۔ ہلاکو خاں کے لیئے وہی سب سے بڑا انعام تھا کیونکہ ابتدائے عشق سے اب تک وہ اس کا ہاتھ تھامنے کے لیئے ترس رہا تھا وہ خوشی سے کھل گیا۔ اس کے نازک سے گورے گورے ہاتھ کو اپنے سخت کھُردرے ہاتھوں میں لے کر اسے دبانے لگا جیسے جیسے وہ اس کی ملائمیت کو محسوس کر رہا تھا، اُس حسینہ کے حصول کے لیئے تڑپتا

جا رہا تھا۔ اس نے کئی بار اس کی ہتھیلی کے کنول کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ بار بار اُس کنول کو چومتا رہا۔ پھر اُس نے یکبارگی اُچھل کر چیختے ہوئے کہا۔

"میں چنگیز خاں کا پوتا ہولاکو ہوں۔ میں اسلامی سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ دو قوزہ! میرا انتظار کر۔ تو میری آخری فتح ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ خیمے سے باہر چلا گیا۔

تب بے شمار گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین کی چھاتی دہلنے لگی۔ جب وہ جنوب مغرب کی طرف اپنے شہسواروں کی معیت میں آگے بڑھا تو آسمان کے کنارے سرخ ہو گئے تھے اور پیشن گوئی کر رہے تھے کہ زمین سے لہو کے چھینٹے اُڑ رہیں گے۔ پہلے وہ اس طرح آگے بڑھا جیسے طوفان کا زور آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ اُس نے پہاڑی سلسلوں کو عبور کیا، تبت کے برف زاروں کا چکر کاٹا! کہیں شکار کھیلتا اور ضیافتیں کرتا، اور کہیں بستیاں اُجاڑتا اور دربار لگاتا چلا۔ ان کا خیر مقدم کیا، جو سر جھکانے آئے۔ جنہوں نے سر اٹھایا، انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

اسے سمرقند کے تربوز پسند تھے۔ لیکن تربوز کھانے سے پہلے اُس نے وہاں کی تمام مسجدوں میں آگ لگا دی۔ ہر طرف شعلے بلند ہونے لگے، دھوئیں کے اُمڈتے اور پھیلتے ہوئے بادلوں میں دوقوزہ نے اپنے محبوب کو اپنے شیریں لبوں کا پہلا بوسہ دیا۔

اُس سر پھرے عاشق کا جنون اور بڑھ گیا۔ اُسے قزل قم کے سرابوں سے بڑی کراہت تھی۔ دُور سے جھیلیں اور ہرے بھرے جنگل نظر آتے لیکن

جب وہ گھوڑا دوڑاتا ان کے قریب پہنچتا تو وہ نظر سے اوجھل ہو جاتے اور منظر بدل جاتا تھا۔ تب وہ کہتا کہ یہ سراب درقوزہ کی طرح ہیں۔ دور سے وہ محبوبہ نظر آتی ہے۔ جب میں قریب پہنچتا ہوں تو سالی سوتیلی ماں بن جاتی ہے۔ ہاہاہا۔۔۔

وہ قہقہے لگاتا آگے بڑھا۔ قزل قُم سے آگے مسلمانوں کی ایک بستی کو اس طرح تباہ کیا کہ وہاں کے کُتّے اور بلّیوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ ایک پیش امام مسجد کی حفاظت کے لئے اس کے آگے سینہ سپر ہوا تو اُسے بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ اُس کے جسم کی ایک ایک بوٹی کاٹ کر اُس کے منہ میں بھرتا گیا۔ درقوزہ قہقہے لگاتی رہی۔ حتٰی کہ پیش امام نے مسجد کے دروازے پر اپنی ہی بوٹیاں نگلتے نگلتے جان دے دی۔

مسلمان اتنے کمزور نہیں تھے کہ اُس بلائے ناگہانی کو نہ روک سکتے لیکن ان کی اصل کمزوری یہ تھی کہ ہر سلطان نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی تھی۔ کسی مسجد میں شیعہ حضرات نہیں جا سکتے تھے۔ کسی مسجد میں سنّی مسلمانوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ کوئی سلجوقی مسلمان تھا، کوئی خوارزمی، کسی کو اپنی دولت پر ناز تھا۔ کسی کو اپنی سلطنت کی وسعت پر اور کسی کو اپنی فوجی طاقت پر گھمنڈ تھا۔

مسلمانوں میں ایسا انتشار کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ عیسائی ان کی نااتفاقیوں سے فائدہ اٹھا رہے تھے اور ہلاکو خان جیسے درندے کو آگے بڑھا رہے تھے گزرتے ہوئے وقت کی آنکھوں نے دیکھا کہ جو مسلمان

صرف خدا سے ڈرتے تھے، وہ ہلاکو خان کا نام سُن کر کانپ جاتے تھے......

ایسے وقت روس کی سرزمین سے ایمان کی روشنی کی کچھ جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ ہوا یوں کہ چنگیز خاں کا ایک حرامی بیٹا جوجی وہاں کا حکمراں تھا۔ وہ اپنے خاندان سے کٹ کر وہاں چلا آیا تھا کیونکہ اُسے طعنے دیئے جاتے تھے اور اُسے چنگیز خاں کا خون نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جوجی کے بعد اس کے دو بیٹے باتو خاں اور برقائی خاں وہاں کے حاکم بن گئے۔ چنگیز خاں کی اولاد کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ لیکن برقائی خاں کے دل میں ایک کانٹا کھٹکتا رہتا تھا کہ وہ ایک حرامی باپ کی نسل سے ہے۔ وہ اپنے وجود پر لگے ہوئے اس دھبّے کو کسی طرح مٹانے کی فکر میں تھا۔ انہی دنوں مسلمانوں کی ایک تبلیغی جماعت وہاں پہنچی اور وہاں کی فضا پانچوں وقت اذان کی آواز سے گونجنے لگی۔

اس سلسلے میں سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ تبلیغی جماعت ایک ایسے شخص کی سرپرستی میں آئی تھی، جو بہت ہی پُر اسرار تھا اس کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں تھا اور حقیقت یہ تھی کہ وہ چور تھا۔ اُسی نے شیخ الجبل کی جنّت کا آدھا خزانہ خالی کر دیا تھا اور اپنی دل پسند حوروں کو اُٹھا کر لے جاتا تھا۔ وہ خود کو پکّا مسلمان کہتا تھا۔ لیکن اُس دور کے مسلمانوں کے متعلّق اس کا فیصلہ تھا کہ وہ سیدھی طرح راہِ راست پر نہیں آئیں گے۔ جب تک یہ ٹھوکریں نہ کھائیں یا ان پر ڈنڈے نہ برسائے

جائیں اُس وقت تک انہیں اپنی ذلت کا احساس نہ ہو گا۔

اُس نے جنت سے اُڑائی ہوئی حوروں کو باقاعدہ تربیت دے کر مسلمان عیاش امیروں کے حرم میں بھیجا تھا۔ تاکہ اُن امیروں کی کمزوریاں ہاتھ آسکیں اور بوقتِ ضرورت وہ ان کی گردن ناپ سکے۔

وہ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کا قائل نہیں تھا۔ اس لئے جنت سے چرائی ہوئی دولت اسلام کی اشاعت میں خرچ کر رہا تھا۔ اُس نے حلوے مانڈے میں مست رہنے والے مولویوں کی کتنی ہی جماعتیں بنائیں انہیں تبلیغی مہم پر روانہ کرنے سے پہلے اُن مولویوں کی اچھی طرح پٹائی کی اور یہ جتا دیا۔۔۔ کہ مذہبی فرائض سے غفلت برتو گے تو ایک دن ڈنڈے کھاتے کھاتے مر جاؤ گے۔

اُس نے برقائی خاں کی جانب جو تبلیغی جماعت بھیجی۔ اس جماعت کے ہر عالم کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسلام کی اشاعت کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرو۔ حلوہ کھانا چھوڑ دو۔ حلوے کی مٹھاس سے منہ میں جو لعاب پیدا ہوتا ہے، اس کے باعث تم کلام پاک کے الفاظ کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکتے لہٰذا جب تک مذہبی مشن پر رہو، سوکھی روٹی اور چٹنی کھایا کرو۔

پھر اُس نے عالموں سے کہا: "جب برقائی خاں کے دربار میں جاؤ تو اُس کے سامنے کلام پاک کی وہ آیتیں پڑھو، جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ صدقِ دل سے کی جانے والی توبہ قبول کرتا ہے۔ ماضی کے تمام گناہ جو براہِ راست یا بالواسطہ سرزد ہوتے ہیں، انہیں ربِّ کریم معاف فرماتا ہے۔ برقائی خاں نے

براہِ راست کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ بالواسطہ گناہ کے باعث وہ حرامی باپ کا بیٹا کہلاتا ہے۔ وہ معصوم ہے اور بے قصور ہے اور اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اُس کے وجود میں لگے ہوئے اس دھبے کو ہمیشہ کے لئے مٹا سکتا ہے۔"

آخر میں اُس نے تنبیہہ کی "دیکھو، اس بُرے وقت کو سمجھو۔ مسلمانوں کی بستیاں نیست و نابود ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر تم ایمان کی سلامتی چاہتے ہو تو اپنے فرائض کو پوری تندہی سے انجام دو۔ اگر تم غفلت برتو گے اور ناکام لوٹ کر آؤ گے تو میں اُلٹا لٹکا کر نیچے الاؤ روشن کر دوں گا اور مُرغِ مسلّم کی طرح تمہارا سراپا بھون کر رکھ دوں گا۔"

اُن عالموں کے دلوں پر اس لٹیرے کی ایسی دہشت تھی کہ وہ ہلاکو خاں کی درندگی اور بربریت کو بھول گئے تھے۔ وہ خاموشی سے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ وہ تبلیغی جماعت جب روس کی چراگاہوں سے گزرنے لگی تو ایک مولوی نے کہا "ہم اپنے وطن میں کیسی خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ دینی کتب کی باتیں لوگوں کو بتاتے تھے۔ اُن کی سمجھ میں آتے یا نہ آتے، ہم اپنے مذہبی فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اس کے عوض ہمیں اچھا کھانے، اچھا پہننے اور آرام سے سونے کی عمدہ جگہ ملتی تھی۔"

دوسرے مولوی نے کہا "اب اُس خبیث کی وجہ سے ہم سفر کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ گرمی اور سردی اور بارشوں میں یہ سفر جاری رکھنے پر مجبور ہیں اور ایسی حالت میں ہم سوکھی باسی روٹیاں کھاتے ہیں۔"

"آخر ہم اچھا کیوں نہیں کھاتے؟ اُس سے خوف کیوں کھاتے ہیں؟ اب وہ سینکڑوں میل دور ہمیں دیکھنے تو نہیں آئے گا۔ ہم مذہبی فرائض ضرور انجام دیں گے کیونکہ یہ کارِ ثواب ہے۔ لیکن درویشانہ خوراک نہیں استعمال کریں گے۔"

وہ سب ایک درخت کے سائے میں رات گزار رہے تھے اور اس فیصلے پر متفق ہو رہے تھے کہ تبلیغی فرائض انجام دینے کے دوران انہیں عیش و آرام سے رہنا چاہیئے۔ ایک مولوی نے کہا کہ وہ صبح ان کے لیئے بہترین کھانا تیار کرے گا۔

لیکن دوسری صبح انہیں اپنے درمیان وہ مولوی نظر نہیں آیا۔ وہ اُس کی تلاش میں نکلے تو کچھ دور جا کر انہیں ایک الاؤ کے قریب اُس کا لباس نظر آیا۔ الاؤ کے اوپر ایک لکڑی بندھی ہوئی تھی۔ اُس لکڑی سے وہ بندھا ہوا اُلٹا لٹک رہا تھا اور اُس وقت تک الاؤ کی آگ میں مسلسل بھونا جا چکا تھا۔

وہ سب سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر وہ سر جھکا کر خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اپنے اُس پُر اسرار سرپرست کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالتا۔ سب ہی کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ ظالم اس جماعت میں موجود ہے چونکہ ہمیشہ رات کی تاریکی میں اس سے احکامات موصول ہوتے رہے تھے لہٰذا کسی نے اُس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اب اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب ہی ایک دوسرے سے محتاط رہنے لگے اور خوف کھانے لگے۔ اُس جماعت کا ہر فرد یہی سوچتا تھا کہ

اس کے شانہ بشانہ جو شخص چل رہا ہے، وہی وہ گمنام، پُراسرار اور ظالم آدمی ہے۔ اگر کسی سے کوئی بھول ہوئی تو وہ بھی الاؤ پر اُلٹا لٹکا دیا جائے گا

وہ اپنے دلوں میں یہی دہشت لئے صراطِ مستقیم پر چلنے لگے وہ پراسرار لیڈر اُس دور کے مسلمانوں کے نفسیات کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

قلعہ المموت کی تباہی کا وقت آ پہنچا تھا۔ شیخ الجبل علاؤ الدین محمدؒ کے پاس روزانہ خبریں پہنچتی تھیں کہ ہلاکو خاں آندھی اور طوفان کی طرح بڑھتا آرہا ہے۔ وہ اب تک باطنیوں کے ستر سے زیادہ قلعے فتح کر چکا تھا۔ اُن قلعوں کے مقابلے میں قلعہ المموت بہت مضبوط اور مستحکم تھا۔ لیکن باہر کی مضبوطی کبھی پائیدار نہیں ہوتی۔ اگر اندر کمزوری ہو تو باہر کے آہنی دروازے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔

قلعہ المموت کے اندر بھی اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ حسن ماژندرانی نے موجودہ شیخ الجبل علاؤ الدین محمد کو قتل کر دیا لیکن وہ قلعہ کا حاکم نہ بن سکا۔ علاؤ الدین محمد کے بیٹے رکن الدین خورشاہ نے حسن ماژندرانی کو مع اس کی اولاد کے قتل کرا دیا اور حسن کی نعش کو جلا دیا۔ رکن الدین خورشاہ سب سے

کم سن حکمران تھا اور حسن بن صباح کا ساتواں جانشین تھا۔

اُن دنوں خواجہ نصیر الدین طوسی جو علوم و فنون میں کمال و فضیلت رکھتا تھا، قلعہ المموت میں ایک نظر بند قیدی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہلاکو خاں کی آمد کی خبریں قلعہ میں پہنچیں تو اس نے سوچا کہ آزادی حاصل کرنے کا یہی موقع ہے اس نے حسن ماژندرانی کے ان آدمیوں کو جو موجودہ شیخ الجبل کی نظروں میں نہیں آئے تھے..... اپنے اعتماد میں لے لیا اور ہلاکو خاں تک یہ خفیہ پیغام پہنچا دیا کہ جب تو المموت کے ناقابلِ تسخیر قلعہ تک پہنچے گا تو اس کا دروازہ خود بخود تیرے لئے کھل جائے گا۔

منصوبے کے مطابق جب ہلاکو خاں قلعہ کی جانب دندناتا ہوا آیا تو حسن ماژندرانی کے آدمی قلعہ کے اندر فدائیوں سے ٹکرا گئے۔ ان سے لڑنے کے دوران انہوں نے اس ناقابلِ تسخیر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ ہلاکو خاں کی جنگی مہمات میں وہ پہلا قلعہ تھا، جو کسی خون خرابے کے بغیر بڑی آسانی سے ہاتھ آگیا تھا۔

موجودہ شیخ الجبل رکن الدین خور شاہ کو چند دنوں کی حکمرانی بھی نصیب نہ ہوئی۔ ہلاکو خاں کے سپاہی اس کی آنکھوں کے سامنے فدائیوں کو چن چن کر قتل کر رہے تھے۔ فدائی تعداد میں بہت کم تھے، اس کے باوجود انہوں نے اطاعت قبول نہیں کی۔ سب ہی نے لڑتے لڑتے جان دی کیونکہ وہ شہید ہو کر اپنے شیخ الجبل کی جنت میں جانا چاہتے تھے۔

کم سن شیخ الجبل کو ہلاکو خاں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے پوچھا۔

"جنّت کسے کہتے ہیں؟"

شیخ الجبل نے جواب دیا۔ "جنّت نیک اور صاحب ایمان کا آخری انعام ہے۔ شاید تو لامذہب ہے، اسی لئے جنّت اور جہنّم کو نہیں سمجھتا ہے۔ جنّت ایک ایسی جگہ ہے جہاں انسان کو دنیا سے زیادہ آرام ملتا ہے۔ وہاں پاؤں تلے مخملی گھاس بچھی رہتی ہے اور سینکڑوں قسم کے رنگ برنگے پھول اپنی خوشبو لٹاتے رہتے ہیں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میں تو سمرقند سے قزوین تک تمام ممالک فتح کرتا آرہا ہوں۔ میں نے ہزاروں قسم کے رنگ برنگے پھولوں کو خوشبو لٹاتے دیکھا ہے اور میرے گھوڑے سبز مخملی گھاس پر دوڑتے آئے ہیں۔ تو اپنی جنّت کی ایسی خوبیاں بتا جو میری نظروں سے کبھی نہ گزری ہوں۔"

شیخ الجبل رکن الدین خورشاہ نے کہا۔ "تو دیکھ رہا ہے کہ یہ گرم علاقہ ہے مگر جنّت میں گرمی اور حبس نہیں ہے۔ وہاں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے بادل سروں پر سے گزرتے ہیں۔"

"یہ ٹھنڈک اور سروں پر سے گزرنے والے بادل ہم ارض منجمد شمالی میں دیکھ چکے ہیں۔"

"جنّت میں ایسی حوریں ہیں جن کے حُسن کی مثال کہیں نہیں ملتی۔"

دوقوزہ وہاں ہلاکو خاں کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ حسن و شباب میں وہ بھی لاجواب تھی۔ ہلاکو خاں نے اس کا ہاتھ تھام کر رکن الدین خورشاہ سے پوچھا۔

"کیا تیری جنت کی حوریں اس عورت سے زیادہ حسین ہیں جو میرے پہلو میں بیٹھی ہے؟"

رکن الدین خور شاہ کشمکش میں گرفتار ہو گیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے سوچا کہ اس درندے کے پہلو میں جو خوبصورت بلا بیٹھی ہوئی ہے، وہ اس کی بیوی یا منظورِ نظر ہو گی لہٰذا وہ اس کے مقابلے میں کسی حور کو حسین نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس نے سوچ سمجھ کر جواب دیا "میں چند دنوں سے حکمران تھا۔ میں نے ابھی تک جنت کی سیر نہیں کی ہے، صرف اس جنت کے قصے سنتا رہا ہوں۔ لہٰذا میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو ملکۂ حسن تیرے پہلو میں ہے اس سے بھی زیادہ کوئی حسین ہو سکتی ہے"

ہلاکو نے انکار میں ہاتھ ہلا کر کہا "نہیں نہیں، تو ابھی شبہ میں گرفتار ہے کہ میری دوقوزہ حوروں سے زیادہ حسین ہے یا نہیں؟ تجھے ابھی جنت میں جا کر ایک اٹل فیصلہ کرنا چاہیے"

اس نے اپنے سپہ سالارِ خاص قطبوغا کو حکم دیا کہ اس کم سن شیخ الجبل کو جنت میں پہنچا دے۔ قطبوغا نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ پھر ذرا سی دیر میں اس کا گلا گھونٹ کر اسے جنت کی طرف روانہ کر دیا۔

اس کے بعد شیخ الجبل کے معتمدِ خاص کو طلب کیا گیا۔ ہلاکو خاں نے اس سے پوچھا۔

"جنت کا راستہ کون سا ہے؟ تم لوگ جیتے جی وہاں کیسے پہنچتے

ہے؟ تو مجھے بھی طرح راستہ بتا دے۔ میں تجھے قتل کرنے کا حکم نہیں دوں گا"

معتمد خاص نے بتا دیا کہ شیخ الجبل کے حجرے میں کھجور کی ایک چٹائی فرش پر بچھی ہوئی ہے۔ اس چٹائی کے نیچے تہہ خانے سے جنت کا راستہ گزرتا ہے۔

دوقوزہ نے ہلاکو سے پوچھا "کیا تو اسے قتل کرنے کا حکم نہیں دے گا کیا تو نہیں جانتا کہ یہ مسلمان ہے؟"

ہلاکو نے جواب دیا "میری جان! میں تیری خواہش کو کبھی نہیں ٹھکراتا۔ میں نے زبان دی ہے کہ اسے قتل نہیں کراؤں گا اور میں اپنی زبان پر قائم رہوں گا البتہ تو اسے قتل کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ اس طرح میرے وعدے کی بھی شرم رہے گی اور تیری خواہش بھی پوری ہو جائے گی"

دوقوزہ نے خوش ہو کر حکم دیا "اس کی گردن اڑا دو"

سپہ سالار خاص نے آگے بڑھ کر عرض کیا "شہزادی دوقوزہ! تیرا حکم سر آنکھوں پر۔ اسے قتل کرنے سے پہلے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ شخص مسلمان نہیں بلکہ باطنی ہے"

دوقوزہ نے پوچھا "کیا تو مسلمان نہیں ہے؟"

معتمد خاص کشمکش میں گرفتار ہو گیا کہ کیا جواب دے۔ اب تک باطنیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ سچے مسلمان ہیں اور حسن بن صباح کی طرح اسلامی شریعت پر عمل کرتے آئے ہیں لیکن دوقوزہ کے سامنے خود کو مسلمان کہنے کا مطلب اپنی گردن کٹوانا تھا۔

اس نے دروقوزہ کے سینے پر صلیب کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ عیسائی عورت ہے لہٰذا جواب بھی اس کے حسبِ منشا دینا چاہیے۔ اس نے کہا۔

"ہم سلجوقی یا خوارزمی مسلمان نہیں ہیں، جو عیسائیوں سے خواہ مخواہ دشمنی رکھتے ہیں۔ ہم عیسائی بھائیوں کے ساتھ ہمیشہ امن و سلامتی سے زندگی گزارتے آئے ہیں۔"

دروقوزہ نے پوچھا۔ "اگر تو عیسائیوں کا حامی ہے تو بتا کہ تو نے کیسی جنت بنائی ہے؟ وہ جنت جس کا ذکر انجیل مقدس میں ہے یا وہ جنت جس کا ذکر مسلمانوں کی الہامی کتاب میں ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "دونوں ہی آسمانی کتابیں ہیں۔ ہم نے دونوں کتابوں کو پیشِ نظر رکھ کر جنت کی تخلیق کی ہے۔"

دروقوزہ نے غصے سے کہا۔ "کیا جنت کی تخلیق کے لئے انجیل مقدس کافی نہیں تھی؟ تو نے مسلمانوں کی کتاب کا سہارا کیوں لیا؟ تو اِدھر بھی ہے اور اُدھر بھی، تو اول درجے کا دوغلا اور فریبی ہے۔ بوغا! حکم کی تعمیل کرو۔"

قتلغ بوغا نے تلوار نکال کر اس کی گردن اُڑادی۔ اس کے بعد وہ سپہ سالار چند سپاہیوں کے ساتھ شیخ الجبل کے حجرے میں گیا۔ حجرے سے جنت تک کا راستہ کشادہ نہ تھا۔ تنگی کے باعث ایک وقت میں ایک ہی سپاہی گزر سکتا تھا۔ قتلغ بوغا نے بارود خانے کے سپہ سالار کو حکم دیا کہ تہہ خانے کو بارود سے اُڑادے۔

اس علاقے میں پہلی بار بارود کا زلزلہ خیز دھماکہ ہوا۔ قلعہ الموت کے

در و دیوار کانپ گئے اور جنّت کی ہری بھری زمین میں جیسے زلزلہ آ گیا شہد اور سرکہ کا ذخیرہ دھماکے سے اُڑ گیا۔ شہد اور سرکہ کچھ اس ترتیب سے رکھا گیا تھا کہ وہ محدود مقدار میں قطرہ قطرہ چشمے کے پانی میں گر کر حل ہوتا تھا اور جنّت سے گزرنے والی نہر کے پانی کو میٹھا اور زود ہضم بناتا تھا۔ اب اس جنّت میں قیامت آ گئی تھی۔ ہلاکو خاں اپنے شہسواروں کے ساتھ مخملی گھاس پر گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ جنّت کے مکین چیختے چلاتے بھاگ رہے تھے اور تیروں اور تلواروں کی زد میں آ کر گر رہے تھے۔ نہر کا ٹھنڈا میٹھا پانی لہو سے سرخ ہو رہا تھا۔ بھاگتی ہوئی حوریں جن شہسواروں کے ہاتھ آئیں۔ وہ بھاگنے کے دوران ہی انہیں اٹھا کر اپنے گھوڑوں پر لاد لیتے تھے اور قہقہے لگاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔

حسن بن صباح نے برسوں کی محنت کے بعد وہ جنّت آباد کی تھی۔ اس کی موت کے بعد ڈیڑھ سو برس تک وہ جنّت باطنی مذہب کی اشاعت کا اہم ذریعہ بنی رہی لیکن ہلاکو خان نے ذرا سی دیر میں اسے جہنّم بنا دیا۔ وہاں کی مخملی گھاس جل کر راکھ اور مٹی بن گئی۔ خوش رنگ پھولوں کی گردنیں تلواروں سے اڑ گئیں۔ نہر کا پانی لہو کی سرخی میں بدل گیا ہر دم چہکنے والے پرندے اس جہنّمی منظر سے سہم کر اڑ گئے اور حوریں شہسواروں کی آغوش میں پہنچ گئیں۔ ہلاکو خاں جوانی کے نشے میں مدہوش تھا کیونکہ اس نے بلا سوچے سمجھے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا تھا اور اب اس کے حمایتی میں دو حوروں کو لئے پڑا تھا۔ جذبات کی ایسی آندھی چلی تھی کہ وہ وقتی طور پر

اپنی پیاری محبوبہ دوقوزہ کو بھی بھول گیا تھا۔

دوقوزہ قلعہ الموت کے عبادت خانے میں بیٹھی فرانسیسی شراب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ فتح کے موقعہ پر وہ ہلاکو خاں کو بے لگام چھوڑ دیتی تھی تاکہ وہ جی کھول کر جشن منائے اور حسین عورتوں کے ساتھ رات گزارے۔ دوقوزہ کو اپنے حسن و شباب اور ہلاکو خاں کی دیوانگی پر ناز تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کہیں ــ ــ ــ بھی جائے گا تو صبح کے بھولے کی طرح شام کو اس کے پاس لوٹ آئے گا اور اس کے ایک بوسے کی بھیک مانگے گا، کیونکہ انسان کو جو چیز آسانی سے نہیں ملتی، وہ اسی کے لئے مچلتا ہے اور تڑپتا ہے۔ دوقوزہ سوچ رہی تھی کہ اب اسے زیادہ نہیں تڑپ پائے گی۔ وہ خود ہلاکو خان کو جی جان سے چاہتی تھی۔ اس وحشی کو دیکھ کر اندر ہی اندر شبابی جذبوں سے سلگتی تھی۔ پھر سوچتی تھی کہ اب دو ہی منزلیں رہ گئی ہیں۔ ایک بغداد اور دوسرے مصر کی اسلامی حکومتوں کا خاتمہ۔ اس کے بعد اس زمین کے کسی بھی حصے میں کوئی اسلامی حکومت نہیں ہوگی۔ مسلمان یا تو مر جائیں گے یا پھر غلاموں کی زندگی بسر کریں گے۔ تب میں اپنی سلگتی ہوئی جوانی کو ہلاکو خاں کے حوالے کر دوں گی۔

وہ ایک مسند پر بیٹھی شراب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ اس کے سامنے اپنے وقت کا عالم فاضل، ماہر نجوم خواجہ نصیر الدین طوسیؒ ہاتھ باندھے ادب سے کھڑا تھا۔ دوقوزہ نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"تو مسلمان ہے اس لئے واجب القتل ہے۔"

خواجہ نصیر الدین نے جواب دیا۔ "خدا کسی کو زندگی دیتا ہے تو اسے

شمارہ سنے کا کسی کو حق نہیں دے سکتا۔"

"ہوں" وہ سر ہلا کر بولی۔ "مگر ہر انسان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ سانپ کو پاؤں تلے کچل ڈالے اور تم سب میری نظروں میں زہریلے سانپ ہو لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہلاکو تجھے قتل نہیں کرے گا۔ خاقان منگو خاں نے حکم دیا ہے کہ تجھے اس کے دربار میں پہنچایا جائے خاقان کو علم نجوم سے گہری دلچسپی ہے۔ اس کے دربار میں جادوگر شامان اور تبت کے سرخ لاما حاضری دیتے ہیں اور اسے غیب کی باتیں بتاتے ہیں۔ وہ تجھے بھی اسی مقصد کے لئے اپنے دربار میں طلب کر رہا ہے۔"

"یہ میری خوش نصیبی ہے کہ خاقان کی مہربانی سے یہاں میری موت ٹل گئی ہے۔"

دوقوزہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اے بوڑھے عالم! میں عورت ہوں اگر تیرا یا چلتر پر آجاؤں تو میرے ابرو کے ایک اشارے پر ہلاکو تجھے قتل کر دے گا اور خاقان کے پاس جھوٹی اطلاع بھیج دے گا کہ تو باطنیوں کی قید میں اذیتیں برداشت کرتے کرتے مر گیا ہے۔"

خواجہ نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "عورت چاہے تو دو مذاہب کو آپس میں ٹکرا سکتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بستیوں سے لے کر بڑے بڑے ملکوں تک کو تباہ و برباد کر سکتی ہے اور ہلاکو خاں جیسے ظالم اور سفاک کی کھوپڑی پر بیٹھ کر حکومت کر سکتی ہے۔ تو چاہے تو بہت کچھ کر سکتی ہے۔"

"ہاں۔ میں چاہوں تو تجھے معاف بھی کر سکتی ہوں، بشرطیکہ تو اپنی جگہ

کسی دوسرے مسلمان کو قتل کرا دے۔"

"میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرے گا کہ میں اپنے کسی ہم مذہب کو قتل کراؤں۔"

دورقوزہ نے پوچھا: "کیا ایک ہی مذہب کے دو افراد ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوتے؟ کیا ایسا کوئی مسلمان تیرا دشمن نہیں ہے جس نے تجھے تکلیف پہنچائی ہو اور جسے تو قتل کرنا چاہتا ہو لیکن اس لئے قتل نہیں کر سکا کہ تجھے صرف قلم پکڑنا آتا ہے، تلوار چلانی نہیں آتی؟"

خواجہ نصیر الدین طوسی نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "ہاں، میرا ایک دشمن ہے جسے میں نے خیال ہی خیال میں کئی بار قتل کیا ہے مگر حقیقتاً اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔"

"کون ہے وہ؟"

"وہ بغداد کے خلیفہ مستعصم باللہ کا وزیر مؤید الدین ابن علقمی ہے۔"

دورقوزہ نے خوش ہو کر کہا: "تیری شخصیت اتنی عظیم ہے کہ تیرا دشمن کوئی بادشاہ یا وزیر ہی ہو سکتا ہے۔ اب یہ بتا کہ وزیر ابن علقمی سے دشمنی کیسے ہوئی؟"

خواجہ نے جواب دیا: "تمام سلاطین کے درباروں میں میرے فضل و کمال کا شہرہ ہے۔ ایک بار میں نے خلیفہ مستعصم باللہ کی مدح میں ایک عربی قصیدہ لکھا تھا لیکن وزیر ابن علقمی نے یہ گوارا نہیں کیا کہ دربار خلافت میں میری رسائی ہو۔ وہ دربار میں میری آمد کو اپنے زوال کا باعث

سمجھتا تھا۔ اس نے خلیفہ کے حضور میں قصیدہ پیش کرنے کے بجائے صرف میرا ایک خط پیش کیا اور اس کی پشت پر میری طرف سے خلیفہ کی شان میں ایسی بے ہودہ عبارت لکھ دی، جسے پڑھ کر خلیفہ مشتعل ہو گیا اس نے مجھے قید خانے میں ڈال دیا۔ پھر ابن علقمی نے مجھے وہاں سے نکال کر یہاں شیخ الجبل علاؤ الدین محمد کے پاس بھیج دیا۔ شیخ الجبل میری علمی صلاحیتوں سے بے حد متاثر تھا۔ وہ مجھے لکھنے پڑھنے کی اجازت دیتا تھا لیکن نظر بند رکھتا تھا۔ اس دوران میں نے خیال ہی خیال میں کئی بار ابن علقمی کو قتل کیا۔ یہ درست ہے کہ میں تلوار پکڑنا نہیں جانتا، صرف قلم چلاتا ہوں لیکن آج مجھے اپنے دشمن سے انتقام لینے کا موقعہ مل گیا ہے۔ اے ملکہ دوقوزہ! اگر تو کسی مسلمان کو قتل کرنا چاہتی ہے تو میں اپنی جگہ ابن علقمی کا نام پیش کرتا ہوں۔"

دوقوزہ نے کہا "تو نے ہلاکو کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس کے لئے اس قلعہ کا دروازہ کھولنے کی سازشیں کیں۔ ہم سب تیری وفاداری کی قدر کرتے ہیں۔ کیا تو اپنی دانشمندی سے ہلاکو کے لئے بغداد کے دروازے نہیں کھول سکتا؟ تو ہلاکو کو وہاں تک پہنچا دے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ابن علقمی کو تیری آنکھوں کے سامنے قتل کیا جائے گا۔"

انسان کتنا ہی عالم فاضل ہو مگر انتقام کے جوش میں اندھا اور عقل سے خالی ہو جاتا ہے۔ خواجہ نصیر الدین نے چشمِ تصور میں اپنے دشمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا لیکن یہ نہ سوچا کہ ایک دشمن کو قتل کرانے کی خاطر بغداد کا دروازہ کھولتے ہی مسلمانوں کا قتلِ عام ہو گا۔

اس نے کہا۔ "یہ قلعہ الموت بہت ہی مضبوط اور ناقابلِ تسخیر تھا لیکن اس کے اندر آپس کے جھگڑوں نے اسے کمزور بنا دیا۔ اسی طرح خلیفہ بغداد کا بظاہر بڑا رعب اور دبدبہ ہے لیکن وہاں کی اندرونی کمزوری یہ ہے کہ بغداد میں شیعہ، اہلِ سنت والجماعت، حنابلہ اور دوسرے اہلِ مذہب میں آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ غنڈے بدمعاش ان جھگڑوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فسادات کی آگ بھڑکاتے ہیں اور لوٹ مار کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں سے حکومت و سلطنت کا رعب اٹھ گیا ہے۔ آمدنی اتنی محدود ہو گئی ہے کہ فوج کو باقاعدہ تنخواہیں ادا نہیں کی جاتیں۔ بغداد کے مغربی حصے میں شیعوں کا مسکن ہے اور وزیر ابن علقمی اس گروہ کا ایک ممتاز رکن ہے جبکہ خلیفہ مستعصم باللہ اہلِ سنت والجماعت کا حامی ہے۔ خلیفہ اس ڈر سے اپنے وزیر کو معزول نہیں کرتا ہے کہ اس کی معزولی سے شیعوں کی بھاری تعداد بغاوت پر آمادہ ہو جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ دوقوزہ نے کہا۔ "تو نے بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ اب یہ بتا کہ ان کی کمزوریوں سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟"

خواجہ نے جواب دیا۔ "اس سلسلے میں وزیر ابن علقمی کو آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے۔ ابن علقمی یہ نہیں چاہتا کہ خلیفہ کی وجہ سے اہلِ سنت کا پلڑا بھاری رہے۔ وہ مستعصم باللہ کو خلافت سے ہٹانے کی خاطر ہلاکو خان کو حملے کی دعوت دے سکتا ہے اور اس کے لئے راستہ ہموار کر سکتا ہے۔"

"خواجہ! تیری دانش مندی کا جواب نہیں ہے۔ تو اپنے ہی دشمن کو آلۂ کار بنانے کی تجویز پیش کر رہا ہے اور یہ نہایت ہی معقول تجویز ہے۔ اب یہ بتا کہ ابن علقمی سے کس طرح رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے؟"

خواجہ نے کہا "ہلاکو خاں کو چاہئے کہ پہلے ابن صلایا والی اربل کو اپنی اطاعت پر مجبور کرے۔ ابن صلایا اور ابن علقمی کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ وہ اپنے دوست کو مشورہ دے گا کہ ہلاکو خاں سے مدد حاصل کی جائے۔ تب ابن علقمی یقیناً تم لوگوں سے رابطہ قائم کرے گا۔ میدانِ جنگ میں گھوڑے دوڑانے سے پہلے دماغی گھوڑوں کو دور دور تک دوڑانا پڑتا ہے۔ صرف تیر و تلوار سے فتح حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ذہانت اور سیاست کی ضرورت ہے۔"

"واقعی تیری ذہانت اور سیاسی چالبازیوں کی داد دینی پڑتی ہے۔ ہلاکو خاں کو تیرے جیسے مشیر کی ضرورت ہے جو بلا امتیاز مذہب و نسل صحیح مشورے دے سکے اور اپنے ہی مشوروں سے اپنے ہی بھائیوں کی گردن کٹوا سکے۔ ہی ہی ہی ہی۔۔۔"

وہ شراب کا جام ہاتھ میں لئے مسند سے اٹھ گئی۔ قہقہے لگاتی اور نشے میں جھومتی ہوئی خواجہ کے سامنے آئی اور بدستور ہنستی ہوئی بولی۔ "خواجہ! تو نے کمال کر دیا۔ جب ہلاکو میدانِ جنگ میں ایک کمال دکھاتا ہے تو میں اسے ایک بوسے کا تحفہ دیتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ تجھے بھی ایک بوسہ دوں مگر تو بہت بوڑھا ہے۔ جوانی کی دہلیز پر تیری سانس پھول

جائے گی ۔ ہی ہی ہی ہی ....."

ہنسی کی تال پر اس کے رس بھرے بدن کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی اور شراب چھلک چھلک کر جام سے باہر خواجہ کے عمامہ کو بھگو رہی تھی ۔

تاتاری فوج قتط بوغا کی سپہ سالاری میں بغداد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وزیر ابن علقمی نے خط و کتابت کے ذریعے ہلاکو خاں کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے لیئے راستے ہموار کر دے گا۔ اس زبردست فوج کے آگے تین شہسوار تھے۔ ایک ہلاکو خاں، دوسرا قتط بوغا اور ان کے درمیان دوقوزہ تھی۔ بغداد کے راستے میں ہلاکو خاں نے کئی چھوٹی چھوٹی فوجی چوکیاں بنالی تھیں۔ جب وہ ایک چوکی کے قریب پہنچے تو ان کی رفتار سست پڑ گئی۔ اس چوکی میں جہاں خیمے نصب تھے، وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

انہوں نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔ ہلاکو خاں حیرانی اور غصے سے دیکھ رہا تھا۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ اب تک دشمن کی فوجوں نے اس کی چوکی پر

حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن کوئی یہ جرأت کر بیٹھا تھا۔ اور غصہ اس بات کا تھا کہ دشمن کی فوج مقابلے پر موجود نہیں تھی اسے نقصان پہنچا کر جا چکی تھی۔

دُور دُور تک بے شمار تاتاریوں کی لاشیں زمین پر پڑی ہوئی تھیں جب وہ آگے بڑھے تو سب سے پہلے ایک تاتاری کی لاش درخت سے لٹکی ہوئی نظر آئی۔ اس لاش کے ننگے سینے پر جلی حرفوں سے لکھا ہوا تھا "بیبرس"

ہلاکو خاں نے گرج کر پوچھا "بیبرس کا کیا مطلب ہے؟"

سب خاموش رہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے خواجہ نصیر الدین کو سامنے لایا گیا۔ اس نے ننگے سینے کی تحریر پڑھ کر کہا۔

"بیبرس۔ یہ قپچاق قبیلے کے کسی ترک باشندے کا نام ہے"

ہلاکو خاں غصے سے آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ وہ لاشوں کے درمیان اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

"کون ہے یہ احمق؟ کہاں رہتا ہے؟ کس علاقے کا حکمران ہے؟ پہلے میں اس کی لاش پر سے گھوڑے دوڑاؤں گا پھر آگے بڑھوں گا۔ معلوم کرو، یہ بیبرس کون ہے، جس نے اپنی موت کو آواز دی ہے۔۔۔۔"

وہ زور زور سے گرج رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی وقت بھی کسی پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے گا۔ قطبوغا نے اپنے کتنے ہی آدمیوں کو مختلف علاقوں کی طرف معلومات کے لئے روانہ کر دیا۔ دوقوزہ نے کچھ لوگوں کو

عیسائی حکمرانوں کے پاس بھیجا۔ ان دنوں ہلاکو خاں نے خبر رسانی کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ ایک خبر رساں تیز رفتار گھوڑے پر اگلی چوکی تک جاتا تھا۔ اُس چوکی سے ایک تازہ دم سوار اسی پیغام کو لے کر روانہ ہو جاتا تھا۔ اس طرح ہر سوار کو اگلی چوکی تک پہنچ کر آرام کرنے کا موقعہ مل جاتا تھا اور پیغام کسی تاخیر کے بغیر منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا تھا۔

اس روز ہلاکو نے اپنی فوج کے ساتھ اسی تباہ شدہ چوکی کے اطراف پڑاؤ کیا۔ اس کے غصے کا یہ عالم تھا کہ وہ کھانا پینا بھول گیا تھا۔ وہ دوپہر تک خیمے کی طرف نہیں گیا۔ وہ پہر سے رات تک شراب کے جام پر جام لنڈھاتا رہا۔ پھر مدہوش ہو کر بستر پر گر پڑا۔ دوسرے دن آنکھ کھلی تو اس کے قاصد یکے بعد دیگرے اپنی اپنی منزل سے لوٹ کر آ رہے تھے اور بیبرس کے متعلق عجیب و غریب قصے سنا رہے تھے۔

باطنی فرقے کے حکمران جو ہلاکو خاں کے زیرِ اثر آ گئے تھے۔ انہوں نے یہ اطلاع بھیجی کہ بیبرس ایک لٹیرے کا نام ہے۔ اس کا صحیح حلیہ بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ رات کی تاریکی میں ڈاکے ڈالتا ہے۔ حسن بن صباح کی جنت کا نصف خزانہ وہی لوٹ کر لے گیا ہے۔ پہلے وہ خاموشی سے آتا تھا اور خاموشی سے لوٹ کر چلا جاتا تھا۔ پھر وہ اپنے نام کا اعلان کرنے لگا کہ وہ بیبرس ہے۔

ہلاکو خاں کے مفتوحہ علاقوں سے خبر آئی کہ ایک لٹیرا پچیس یا تیس مسلح نوجوانوں کے ساتھ اچانک ہی شب خون مارتا ہے۔ اناج کے ذخیروں

میں آگ لگاتا ہے اور گھوڑے اور ہتھیار لوٹ کر لے جاتا ہے۔ اس لٹیرے کی پہچان یہ ہے کہ وہ کانا ہے اور بائیں ہاتھ سے تلوار چلاتا ہے اور اپنے پیچھے ایک نام چھوڑ جاتا ہے۔ "بیبرس!"

غازہ میں متحدہ صلیبیوں کی ایک فوج تھی۔ وہاں سے اطلاع ملی کہ بیبرس پہلے ایک لٹیرے کی طرح چھوٹے چھوٹے فوجی قافلوں کو لوٹتا تھا۔ دو روز پہلے وہ اچانک ہی ایک بھاری لشکر کے ساتھ نمودار ہوا۔ صلیبی فوج سے ساتھ جم کر مقابلہ کیا۔ پھر انہیں اچھی طرح نقصان پہنچا کر جہاں سے آیا تھا، وہاں چلا گیا۔ وہ کہاں سے آیا تھا؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

صلیبیوں کی سب سے بڑی عسکری قوت فرانس میں تھی۔ وہاں سے خبر آئی کہ وہ لٹیرا شاہ لوئی فرانس کے فوجی دستوں کو بھی ایک بار نقصان پہنچا چکا ہے۔ یہ ساری خبریں ایسی تھیں اس لٹیرے کی شخصیت کی دھاک جمارہی تھیں۔

یہ خبریں صرف ہلاکو خاں کو ہی نہیں، دو قوزہ کو بھی مشتعل کر رہی تھیں۔ دو قوزہ اس لئے غصے سے تلملا رہی تھی کہ وہ بیبرس نامی لٹیرا عیسائی فوجوں کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ ہلاکو خاں اس لئے غیض و غضب سے اچھل رہا تھا کہ وہ بیبرس کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہ تھا۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کسی خاص علاقے کا حاکم ہے یا صرف خانہ بدوش لٹیرا ہے۔ اس کی داستانوں کا لب لباب یہ تھا کہ وہ محض ایک لٹیرا تھا اور طوفان کی طرح انہیں جانی و مالی نقصان پہنچا کر گذر جاتا تھا۔

ایک وقت تھا، جب ہلاکو خاں دشت سے اچانک ہی ایک خونخوار بھیڑیے کی طرح نمودار ہوا تھا، ٹھیک اسی طرح بیبرس بھی اچانک ہی ایک بھیڑیے کی طرح ان کی معلومات کے افق سے ابھرا تھا۔ ہلاکو خاں مسلمانوں کے خون سے کھیل رہا تھا اور وہ عیسائیوں کے لہو کے چھینٹے اڑا رہا تھا۔

دوقوزہ نے ہلاکو خاں کے خیمے میں آکر دیکھا تو وہ غم غلط کرنے یا غصہ غلط کرنے کے لیئے بے تحاشہ شراب کے جام چڑھا رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے سے شراب کا جام چھینتی ہوئی بولی۔

"غصے کی آگ میں جلنے سے کچھ نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ وہ تیرے مفتوحہ علاقوں میں تباہی مچا رہا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ وہ اپنے پیچھے نقشِ قدم بھی چھوڑ کر نہیں جاتا ہے ورنہ کب کا مارا جاتا۔ اگر وہ ایسا ہی دلیر ہے تو ایک دن تیرے مقابلے پر ضرور آئے گا۔ یا یوں سمجھ لے کہ اس کی موت اسے تیرے پاس کھینچ لائے گی۔ اس وقت تک تجھے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔"

ہلاکو نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اب صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے اگر بیبرس کے متعلق اطلاع ملتی کہ وہ کس علاقے میں ہے تو وہ بغداد کی مہم ملتوی کر کے پہلے اس لٹیرے کا سر کچلنے کی حسرت پوری کر لیتا مگر یہ بڑی مجبوری تھی۔ اس لیئے وہ بغداد کی طرف بڑھنے لگا۔

راستے میں اس کی دوسری چھ کمیاں صحیح سلامت تھیں۔ بیبرس نے انہیں نقصان نہیں پہنچایا لیکن اس کے متعلق نت نئی داستانیں وہاں بھی سنی

گئی۔ دوقوزہ غصے سے تلملا رہی تھی کیونکہ ہر داستان سے یہی علم ہوتا تھا کہ بیبرس صلیبی افواج کو زیادہ نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس نے جھلا کر ہلاکو سے کہا۔ "جب تو مسلمانوں کی آخری عسکری قوت مصر کو فتح کرے گا اور میرے لئے مسلمانوں کی کھالوں کا بستر بنائے گا تو اس میں بیبرس کی کھال کا ہونا بھی لازمی ہے۔"

ہلاکو نے کہا۔ "تو اپنی شرط میں ایک ایسے شیطان کی کھال کا اضافہ کر رہی ہے جو بظاہر کہیں موجود نہیں ہے۔ اگر وہ ابھی مل جائے تو میں ابھی اس کی کھال کھینچ لوں گا۔ تو شرط نہ لگاتے تب بھی میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میرا خیال ہے کہ بغداد پہنچ کر ہمیں اس کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوں گی۔"

وہ شخص ہلاکو اور دوقوزہ کے درمیان مستقل گفتگو کا موضوع بن گیا تھا۔ اس نے ہلاکو جیسے درندے کے دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ وہ درندہ اپنے آس پاس، دور کے علاقوں میں تباہی و بربادی کی خبریں سنتا تھا اور خیالی بیبرس کو اپنے چاروں طرف گشت کرتا ہوا دیکھتا تھا لیکن اسے پکڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ قزل قم کا سراب تھا۔ دور سے نظر آتا تھا لیکن قریب جاتے ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔

تاہم تمام اسلامی ممالک میں ابھی تک ہلاکو خاں کے نام سے دہشت طاری تھی۔ بغداد والوں کو بھی جب یہ پتہ چلا کہ وہ دہشت کا بھیڑیا سر پر آ پہنچا ہے تو سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ وہاں اتحاد اور اسلامی اخوت نام کی

کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ تمام مسلمان مختلف فرقوں میں تقسیم ہو کر ایک اجتماعی قوت سے محروم ہو چکے تھے اور یہ وہی بغداد تھا، جو پانچ صدیوں سے خلفائے عباسیہ کا دارالخلافہ بنا رہا تھا۔

ہلاکو خاں نے اس شہر کو چاروں طرف سے گھیر کر خلیفہ کے نام ایک سوال نامہ بھیجا۔

"تم جانتے ہو کہ چنگیز خاں کے زمانے سے اب تک دنیا کی مختلف قوموں کا ہم مغل تاتاریوں کے ہاتھوں کیا حشر ہوا؟ بغداد کے دروازے کبھی خوارزمیوں اور سلجوقیوں پر بند نہیں ہوئے۔ پھر تم ہمیں کیوں کر داخل ہونے سے روک سکتے ہو جبکہ ہم اس قدر طاقتور ہیں۔ دیکھو پسر چنگیزی کے مقابلے پر نہ آنا ورنہ تمہاری خیر نہیں ...."

بغداد کا آخری تاجدار خلیفہ مستعصم باللہ لڑ نے مرنے پر تیار ہو گیا۔ جہاد کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن وزیر ابن علقمی پہلے ہی خلیفہ کی فوج کو کمزور بنا چکا تھا۔ اس نے اپنے فرقے کے تمام فوجیوں کو حکم دے دیا کہ وہ اس جنگ میں غیر جانبدار رہیں۔ جب تاتاری فوجیں بغداد کے دروازوں میں گھس آئیں تو ابن علقمی نے اپنے آدمیوں کو دجلہ کا بند توڑنے کے لئے کہہ دیا بند ٹوٹتے ہی دجلہ کا پانی بغداد کے چاروں طرف پھیل گیا۔ سیلاب لانے کا مقصد یہ تھا تھا کہ باہر سے مصری فوجیں خلیفہ کی مدد کے لئے نہ آسکیں اور بغداد سے کوئی زندہ بچ کر نہ جا سکے۔

ہلاکو نے یہی کیا۔ عام خونریزی کا حکم دے دیا ــــ اس کے حکم سے

مطابق قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ عورتیں اور بچے اپنے سروں پر قرآن مجید رکھے، گھروں سے واویلا وا مصیبتا کا شور مچاتے ہوئے نکلے۔ تاتاریوں نے بچوں کو نیزوں کی انی پر اٹھا لیا۔ ماؤں کی دودھ بھری چھاتیوں کو کاٹ کر در و بام سے لٹکا دیا۔ جس دن ہلاکو بغداد میں داخل ہوا، ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمان مارے گئے۔ کئی دن تک مکانوں سے شعلے بلند ہوتے رہے اور بغداد کے آسمان پر دھوئیں کے بادل چھاتے رہے۔ شاہی کتب خانے میں جو علمی ذخائر تھے، انہیں دجلہ میں پھینک دیا گیا۔ یہ ایسی زیادتی ہوئی کہ اسلامی تہذیب کی عکاس تصانیف ماضی کے اندھیرے میں ہمیشہ کے لئے گم ہو گئیں۔

جب قتل عام کا بازار ذرا سرد ہوا تو ہلاکو خان اور دوقوزہ نے شاہی محل کے باہر ایک اونچی مسند پر بیٹھ کر خلیفہ مستعصم باللہ اور وزیر ابن علقمی کو طلب کیا۔ خلیفہ دو دن کا بھوکا تھا۔ ہلاکو خان نے چاندی کے برتنوں میں ہیرے جواہرات رکھ کر اسے پیش کئے اور خود معمولی برتنوں میں کھانا کھاتے ہوئے بولا۔

"جو سونا چاندی اور ہیرے جواہرات تم نے جمع کئے ہیں، انہیں کھاؤ۔"

خلیفہ نے عاجزی سے پوچھا۔ "میں انہیں کیسے کھا سکتا ہوں؟"

"پھر تم نے یہ دولت کیوں جمع کی ہے؟"

خلیفہ مستعصم باللہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ ہلاکو نے محل کی آہنی جالیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے ان لوہے کی جالیوں کو پگھلا کر آہنی تیر اور تلوار کیوں نہیں بنائے؟
تم نے یہ جواہرات جمع کرنے کے بجائے اپنے سپاہیوں کو باقاعدہ تنخواہیں کیوں نہیں دیں؟ تم نے اپنی حرم میں خوبصورت کنیزوں کا اضافہ کرنے کے بجائے جانباز اور جنگ جو سپاہیوں کا اضافہ کیوں نہیں کیا؟ تاکہ وہ جانبازی سے آگے بڑھتے اور شہر سے باہر کھلے میدان میں میرا مقابلہ کرتے۔ تم نے تباہی کو اپنا مقدر کیوں بنا لیا؟"

خلیفہ نے جواب دیا "تقدیر اللہ بناتا ہے۔ اللہ کی یہی مرضی تھی"
ہلاکو نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "تو پھر جو کچھ تم پر ابھی گذرے گا وہ بھی اللہ کی مرضی ہو گی"

اس نے حکم دیا کہ خلیفہ کو سمور کے لبادے میں لپیٹا جائے۔ وزیر ابن علقمی ہلاکو کے قریب ادب سے کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا اور خلیفہ کی موت کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

جب اسے سمور کے لبادے میں لپیٹ کر زمین پر سلا دیا تو اس پر سے تاتاری سپاہی اپنے گھوڑے گذارنے لگے۔ سمور کے اندر سے اس کی گھٹی گھٹی سی آواز آتی رہی اور گھوڑے یکے بعد دیگرے اسے پاؤں تلے روندتے ہوئے گذرتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ سمور کے اندر ہی تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

وزیر ابن علقمی ہلاکو خاں سے اجازت لے کر کھلے میدان میں آیا۔ اس نے سمور کا لبادہ کھول کر خلیفہ کی لاش باہر نکالی۔ پھر یہ کہہ کر خلیفہ کی لاش کو پاؤں تلے روندنے اور قہقہے لگانے لگا کہ میں اہل بیعت رسالت کے خون کا بدلہ لے رہا ہوں۔ مسلمانوں کی آپس کی شدید نفرتوں کا یہ تاریخی

واقعہ ۱۲۵۸ء کا ہے۔

جب وہ جی بھر کر لاش کو روندنے کے بعد اس پر سے اُترا تو دوقوزہ کی جانب دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا کیونکہ دوقوزہ کے پاس اس کا پرانا دشمن خواجہ نصیرالدین طوسی کھڑا ہوا تھا۔

دوقوزہ نے پوچھا "ابن علقمی! تیرا مذہب کیا ہے؟"

ابن علقمی نے ادب سے جھک کر کہا "میں مسلمان ہوں۔"

پھر پوچھا گیا "خلیفہ مستعصم باللہ کا مذہب کیا تھا؟"

اس نے جواب دیا "وہ بھی مسلمان تھا۔"

تب دوقوزہ نے کہا "جب تو مسلمان ہو کر اپنے مسلمان خلیفہ کی لاش کو پاؤں تلے روند سکتا ہے تو ہم یہ کیسے توقع کریں کہ تو ہمارا وفادار بن کر رہ سکے گا۔ ہلاکو کے قدموں میں غداروں کو پناہ نہیں ملتی۔ تیری زندگی اور موت کا فیصلہ خواجہ کرے گا۔"

ابن علقمی نے خواجہ کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا لیکن خواجہ کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ملکہ دوقوزہ! میں چاہتا ہوں کہ اسے گھوڑے کی دُم سے باندھ کر اس وقت تک گھسیٹا جائے جب تک کہ یہ مر نہ جائے۔"

خواجہ کی خواہش پوری کی گئی۔ ابن علقمی کو گھوڑے کی دُم سے باندھ کر گھوڑے کو تیز رفتاری سے دوڑایا گیا۔ وہ چیختا چلاتا رہا۔ سنگریزوں پر لہولہان ہوتا رہا۔ پھر اسی طرح اذیتیں برداشت کرتے کرتے مر گیا۔

اس کے بعد ہلاکو خاں نے خواجہ نصیر الدین سے کہا۔ "خواجہ! تو بھی مسلمان ہے مگر بغداد کے مسلمانوں کی تباہی کا سہرا تیرے سر ہے۔ غداری میں تیرا شمار سب سے پہلے ہے مگر افسوس کہ میں تجھے سزا نہیں دے سکتا۔ تو میرے پاس خاقان منگو خاں کی امانت ہے۔ تو آج یہاں سے چلا جا۔ میں کسی غدار کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔"

اس کے حکم سے خواجہ کو اسی دن چند سپاہیوں کی نگرانی میں منگو خاں کے پاس قراقرم بھیج دیا گیا۔ اس کی روانگی کے بعد اس وقت بغداد میں کوئی مسلمان نہ رہا۔ جو خوش قسمتی سے بچ گئے تھے، وہ دریائے نیل کی طرف بھاگ گئے۔

وہ دن ہے اور آج کا دن، پھر کبھی بغداد کو عالم اسلام کا مرکز بننا نصیب نہ ہوا۔

ایسے وقت جبکہ مذہب اسلام آخری ہچکی لے رہا تھا، بیبرس میدان عمل میں آ گیا۔

بغداد کی فتح کے بعد مصر کے ایوانوں میں ہلاکو خاں کی ایسی دہشت طاری ہو گئی اور ایسی افراتفری کا مچی کہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر بیبرس نے مصر کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا اور قطز نامی ایک امیر کو برائے نام سلطان بنا کر تخت پر بٹھا دیا۔

اس نے خود سلطان بننا گوارا نہ کیا۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ میری قوم کو ایک سلطان کی نہیں، بلکہ ایک ایسے اتالیق کی ضرورت ہے جو چابک مار کر اسے سدھارے اور وہ یہی کرتا تھا۔ اسے اپنے سوا کسی پر اعتبار نہیں تھا۔

راتوں کو بھیس بدل کر گشت لگاتا اور خود اپنے لئے مخبری کرتا تھا۔ قاہرہ کے بازارِ حسن میں جہاں شراب اور حشیش کی دکانیں تھیں اور جہاں جوان رنڈیوں اور خوبصورت یونانی لونڈوں کے درمیان رقابت کے باعث جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ وہاں وہ اچانک ہی پہنچ جاتا تھا۔ شراب اور حشیش فروخت کرنے والوں کو شراب کے مٹکوں میں ڈبو کر مار ڈالتا تھا۔ شرابیوں اور بازارِ حسن کے گاہکوں کو کوڑے مار مار کر تلوار پکڑنے پر مجبور کرتا تھا۔ جو تلوار چلانے میں مہارت حاصل نہ کر سکتے، انہیں، ہیجڑا بنا کر چھوڑ دیتا۔ تاکہ وہ کسی رنڈی یا لونڈے کے پاس نہ جا سکیں۔ بہت کم مدت میں لوگ اس کا نام سن کر ہی تھرانے لگے۔ اس کی سلطنت کی حدود میں جتنے مرد تھے ان کے لئے حکم تھا کہ وہ دن کا آدھا حصہ فوجی تربیت حاصل کرنے میں گزاریں۔ اگر کوئی ایک دن بھی آرام کرنا چاہتا تو اسے بڑی عبرتناک سزا دی جاتی تھی۔ جب وہ کسی سپاہی کی شجاعت سے خوش ہوتا تھا تو اسے انعام میں ایک عیسائی لڑکی دیتا تھا۔

علمائے دین اس سے نالاں تھے۔ وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ بیبرس اسلام کی خاطر بڑے بڑے کارنامے انجام دے رہا ہے لیکن غیر اسلامی حرکتیں بھی کرتا رہتا ہے۔ کسی عالم نے کہا۔

"یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ تو اپنے سپاہیوں کو انعام کے طور پر عیسائی لڑکیاں دیتا رہتا ہے۔ کیا انہیں تمغے یا نقد اشرفیاں انعام میں نہیں دے سکتا؟"

اس نے جواب دیا۔ "انعام لینے والے اگر انعام کی ناقدری کریں تو نقد اشرفیوں کو عیاشی میں خرچ کر سکتے ہیں۔ اور اگر انعام کی قدر کریں تو عیسائی

لڑکیوں کو پیار و محبت سے مسلمان بنا کر نیکی کما سکتے ہیں۔"

وہ عیسائی اور مسلمان تاجروں کے جواہرات کے انبار اور عیاش امیروں کے خزانے ضبط کر لیتا تھا یا لوٹ لیتا تھا اور کہتا تھا "لوٹ مار جائز نہیں ہے لیکن علماء میرے خلاف خواہ کیسے ہی فتوے صادر کریں، میں وہی کروں گا جو وقت کا تقاضا ہے اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ عیاش امیروں کی دولت کافروں کے خلاف جہاد کے لئے خرچ کی جائے۔"

وہ اپنے طور پر جو درست سمجھتا تھا، کرتا تھا۔ علماء اعتراض کرتے تھے لیکن اس سے بحث کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے کیونکہ انہیں اپنی زندگیاں عزیز تھیں۔ کتنے ہی تاجروں اور امیروں نے اس کے خلاف محاذ بنا کر اور مذہب کی آڑ لے کر اسے بدنام کرنا چاہا مگر ان کے سر اٹھاتے ہی اس نے ایک سو اسی امیروں کے سر قلم کر دیے۔ وہ اپنے دور کا واحد سرپھرا مسلمان تھا جو بیک وقت کافروں کے خلاف جنگ کی تیاریاں بھی کر رہا تھا اور مسلمان شرپسندوں کے سر بھی کچل رہا تھا اور تاتاری اور صلیبی قوتوں سے ٹکرا جانے کے لئے ہر جائز و ناجائز عمل سے گزر جاتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد ہلاکو خان کا پیغام پہنچا۔ یہ اس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے۔ اپنی فصیلیں منہدم کر دو اور اطاعت قبول کر لو۔ اگر یہ بات مانو گے تو تمہیں امن و چین سے زندہ رہنے دیا جائے گا۔ اگر تم نے یہ بات نہ مانی تو پھر جو پیش آنا ہے، پیش آئے گا اور ہم کیا جانیں کیا پیش آئے گا۔ اس کا علم تو صرف "مونگ کے تنگیری" (جاودانی آسمان) کو ہے۔"

اُن دنوں قاہرہ کے بہت سے علاقوں میں وہ پناہ گزیں آباد تھے، جو بغداد سے اپنی جانیں بچا کر آئے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر ہلاکو خاں کی طاقت، ظلم اور بربریت کے افسانے سناتے رہتے تھے۔ ان افسانوں نے مصر کے مسلمانوں کو بہت زیادہ سراسیمہ اور دہشت زدہ کر دیا تھا۔ بیبرس نے ان کے دلوں سے خوف و دہشت دور کرنے کے لئے ہلاکو خاں کے پاس سے آئے ہوئے سفیروں کو قتل کر دیا اور شہر میں چاروں طرف ان کی لاشوں کو لٹکا دیا۔ اس کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہو کر شاہراہوں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے کہنے لگا۔

"مسلمانو! ان لاشوں کو دیکھو۔ میں ہلاکو خاں کے فرمان کے جواب میں یہ لاشیں اس کے پاس بھیجوں گا۔ تم اس کے قہر و غضب کا اندازہ کر لو کہ اسے موقعہ دیا گیا تو وہ تمہیں چن چن کر قتل کرے گا۔ اب تمہارے سامنے سلامتی کا یہی ایک راستہ ہے کہ بزدلوں کی طرح دشمنوں کے ہاتھوں ذلتیں اٹھا کر مرنے کے بجائے جم کر اس کا مقابلہ کرو اور بہادروں کی طرح لڑتے لڑتے یا تو شہید ہو جاؤ یا فاتح بن کر غازی کہلاؤ۔"

اور واقعی مصری باشندوں کے سامنے یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ بزدلی نہ دکھائیں اور ہلاکو خاں سے ہمدردی اور رحمدلی کی توقع نہ کریں۔ سب جانتے تھے کہ وہ اپنے سفیروں کے قتل کا انتقام لینے کے لئے مسلمانوں کے بچے بچے کو بے دردی سے قتل کرے گا۔ ان کے گھروں میں آگ لگائے گا اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی کرے گا۔ یا تو وہ اپنی تباہی اور ذلتیں برداشت

کر لیں یا پھر غیور مسلمانوں کی طرح جیدار کا سے اس کا مقابلہ کریں۔

بیبرس مقابلے کی جو تیاریاں کر رہا تھا، انہیں دیکھ کر لوگوں کا حوصلہ بڑھ رہا تھا۔ وہ آئے دن تربیت یافتہ سپاہیوں کی جنگی مشقوں کی نمائش کرتا تھا۔ لاکھوں افراد کی موجودگی میں تلوار بازی اور تیر اندازی کے کمالات دکھائے جاتے تھے۔ نوٹنکی کے انداز میں کمالات دکھانے کے دوران وہ ہلاکو خاں کے خلاف دلچسپ مکالمے بھی ادا کرتے تھے۔ تماشہ اس طرح ہوتا تھا کہ چند نوجوان لڑکیاں کھلے میدان میں ادھر ادھر بھاگتی رہتی تھیں۔ بیبرس کے ترک سپاہی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے ایک ایک لڑکی کو اٹھا کر بغل میں داب لیتے تھے اور آگ کے شعلوں سے گزرنے کے بعد لاکھوں کے مجمع میں چاروں طرف گھومتے ہوئے کہتے تھے۔

"ہم اسی طرح ہلاکو خاں کے خیموں میں آگ لگائیں گے اور اس کی عورتوں کو اٹھا کر یہاں لے آئیں گے۔"

پھر ایک سپاہی پوچھتا یہ کیا بات ہے؟ ہلاکو خاں ہم مصری مسلمانوں کی طرف بڑھنے سے کیوں کترا رہا ہے؟"

دوسرا سپاہی جواب دیتا "شیر ببر بیبرس نے دشمنوں کی پیش قدمی کے راستے مسدود کر دیے ہیں۔ اس نے دریائے فرات تک تمام گھاس جلا ڈالی ہے اور باغات کے درخت کاٹ ڈالے ہیں اور دیہات میں آگ لگا دی ہے، تاکہ تاتاری فوج کو خوراک اور ان کے گھوڑوں کو گھاس نہ ملے اور وہ صلیبیوں اور باطنیوں کے قاصدوں کو پکڑ کر یہاں لے آیا ہے اور یہ تماشے دکھا

رہی ہے۔ تاکہ وہ ہماری جنگی تیاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اپنے حکمرانوں سے جا کر کہہ دیں کہ اس جنگ میں غیر جانبدار رہنے میں ہی ان کی بھلائی ہے۔"

اس کے بعد بیبرس مجمع کے سامنے آتا اور لوگوں سے کہتا کہ اس سے کوئی سوال کریں۔ تب کوئی پوچھتا "کیا ہلاکو خاں سے کبھی تیرا سامنا ہوا ہے۔"

وہ جواب دیتا "کبھی سامنا نہیں ہوا۔ اس کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے کے عاشق ہیں۔ میرے معشوق نے وعدہ کیا ہے کہ میدان جنگ میں اپنی قاتل ادائیں دکھائے گا" اس بات پر قہقہے گونجنے لگتے۔ پھر کوئی پوچھتا "بیبرس! تو بائیں ہاتھ سے تلوار کیوں چلاتا ہے؟"

وہ جواباً کہتا "اس لئے کہ میں تاتاریوں کو شکست دینا بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتا ہوں۔ میں دشمن کو کمزور نہیں سمجھتا اس لئے تلوار اٹھاتا ہوں میں دشمن کو حقیر سمجھتا ہوں، اس لئے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن اڑانا چاہتا ہوں"

مجمع میں چاروں طرف "واہ، واہ" کے کلمۂ تحسین و آفرین گونجنے لگتے وہ چھچھلے انداز میں ہلاکو خاں کا مذاق اڑاتا تھا اور بڑے ہی نفسیاتی طریقوں سے لوگوں کے دلوں سے ہلاکو خاں کی دہشت کم کرتا جاتا تھا۔

یہ نفسیاتی حربے بڑے کامیاب ثابت ہوئے۔ ہلاکو خاں پر بھی ان کا خاصا اثر پڑا۔ بیبرس کے گرفتار کئے ہوئے صلیبی اور فدائی جب آزاد ہو کر اپنے ملکوں میں جاتے تو وہاں کے حکمرانوں کو بیبرس کی جنگی تیاریوں کے متعلق بتاتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ وہ اور اس کے سپاہی ہلاکو خاں کا

کس طرح مذاق اُڑایا کرتے ہیں۔ یہ تمام باتیں تاتاریوں تک پہنچتی تھیں اور ہلاکو اپنی قوم کے سامنے سبکی محسوس کرتا۔ اب تک کسی نے ایک معمولی تاتاری سپاہی سے مذاق کرنے کی جرأت نہیں کی تھی، کجایہ کہ اُن کے فاتحِ اعظم کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا۔ وہ تو پہلے ہی بیبرس کے خون کا پیاسا تھا۔ اب اپنی شخصیت کا مذاق بنتے دیکھ کر وہ انگاروں پر لوٹنے لگا۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ فوراً ہی بیبرس کا سر کچلنے کے لئے اپنی فوج کو آگے نہیں بڑھا سکتا تھا کیونکہ دریائے فرات کے پار تمام گھاس نذرِ آتش ہو گئی تھی اور بستیاں کھنڈر بن گئی تھیں۔ اب اپنے سپاہیوں اور گھوڑوں کے لئے اناج اور گھاس کا بہت بڑا ذخیرہ ساتھ لے جانے کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت کی چیزیں اس کے مفتوحہ علاقوں سے لا کر ابھی جمع کی جا رہی تھیں۔

لیکن ہلاکو کو مصر کی طرف بڑھنا نصیب نہ ہوا۔ قراقرم سے اطلاع آئی کہ خاقان منگو خاں کا انتقال ہو گیا ہے اور اب قبیلے کے دستور کے مطابق قرولتائی کے لئے یعنی نئے خاقان کے انتخاب کے لئے اُسے واپس جانا تھا۔ ان کے لئے لازم تھا کہ چنگیز خاں کی نسل کا کوئی بھی فرد دنیا کے کسی بھی حصے میں کیوں نہ ہو، قرولتائی کے وقت اپنے مرکز میں پہنچ جائے۔

دوقوزہ نے اُسے سمجھایا۔ "ہولاکو! واپس جانا دانشمندی نہیں ہے۔ تو ریگستان کے ایک ذرا سے ٹکڑے کو پار کر کے مصر کے علاقے میں

پہنچ جائے گا۔ یہ تیری آخری منزل ہے۔ اسے فتح کرتے ہی تو پورے مشرق وسطیٰ کا مالک بن جائے گا۔ پھر ہم ان خیموں کو چھوڑ کر دریائے نیل کے کنارے کسی عشرت کدے میں رہیں گے۔ تو میری مشروط سیج تیار کرے گا اور میں اُس سیج پر تیرے لئے اپنے بہشت زیبن کے دروازے کھول دوں گی۔"

ہلاکو خاں اُسے بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُس فاتح کی زندگی میں دوقوزہ ہی ایک ایسی تھی جسے وہ اب تک فتح نہیں کر سکا تھا۔ اُسے جیتنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ مصر کے آخری قلعے پر دھاوا بولتا۔ اس طرح بیبرس کا سر کچلنے کی جلتی ہوئی خواہش بھی پوری ہو جاتی۔

وہ بہت دیر تک کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "دوقوزہ! تو میری پہلی اور آخری آرزو ہے۔ تجھے جیتنے کے بعد میں کسی اور ملک کو فتح نہیں کروں گا۔ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ میں کیسا خودسر اور ضدی ہوں۔ چاہوں تو ابھی تجھے زبردستی اپنی آغوش میں سمیٹ کر اپنا بنالوں مگر تو ہی بتا کہ میں ایسا کیوں نہیں کرتا؟"

"اسی لئے کہ تو اپنے قبیلے کے رسم و رواج کا پابند ہے۔ تو نے مجھے حاصل کرنے کے لئے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا کیونکہ تم سب کی رگوں میں چنگیز کا خون دوڑ رہا ہے۔ اسی طرح تو اپنے قبیلے کے رواج کے مطابق مجھے جبراً اپنی آغوش میں نہیں لے سکتا کیونکہ جب تک میں اپنی خوشی سے تیرے پاس نہ آؤں، اُس وقت تک میں تیرے باپ کی بیوہ سمجھی جاؤں گی۔ تجھے لازم ہے کہ اس وقت تک تو میرا احترام کرے۔"

"ہاں دروقوزہ! تو یہ تسلیم کرتی ہے کہ ہم دشت کے رہنے والے چنگیز کی بچھ جیسی حسین عورت کی خاطر بھی اپنے دستور کے خلاف قدم نہیں اٹھاتے۔ پھر میں تیرے کہنے سے دستور کے خلاف یہاں کیسے رُک جاؤں؟ باپ دادا کے زمانے سے قرہ قرم کی جو رسم چلی آرہی ہے، اس میں شرکت کیوں نہ کروں؟"

دروقوزہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس نے سر کو جھکا لیا۔ ہلاکو نے کہا۔

"مایوس نہ ہو دروقوزہ! تو بھی میرے ساتھ واپس جائے گی۔ ہم جلد ہی قرہ قرم سے واپس آئیں گے بیبرس کو شاید کچھ عرصہ اور زندہ رہنا ہے۔ یہاں آکر میں اس کی زندگی کا آخری دن مقرر کر دوں گا۔"

اُس نے واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دوسرے دن اپنے سپہ سالار قطبِ بوغا کو ایک لشکر کے ساتھ دریائے یردن کے پاس چھوڑ دیا۔ تاکہ وہ مغل تاتاریوں کی عسکری سرحد کی حفاظت کرتا رہے۔ پھر وہ اپنے لشکر کے ساتھ شمال کی طرف قرہ قرم کے لئے روانہ ہو گیا۔

جب بیبرس کو یہ خبر ملی کہ وہ اپنے وطن واپس جا رہا ہے اور فلسطین میں اپنی ایک مغل فوج چھوڑ گیا ہے تو اس نے موقعہ سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آسکتا تھا کہ اُس زمانے کا کوئی مسلمان یا عیسائی حکمراں مغل تاتاریوں کو للکار سکتا ہے اور ان پر حملہ کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ بیبرس نے یہ جرأت کی اور اُس وقت کی تمام صلیبی عسکری طاقتوں کو حیرت زدہ کر دیا۔

قطبِ بوغا غولیاث کے کنوئیں کے کنارے اپنے لشکر کے ساتھ خیمہ زن تھا۔

وہ مقابلے کے لئے عین الجلوت کے قریب گلیلی کے میدان میں آگیا بیبرس ایک عیار سپہ سالار تھا۔ اُس نے ترک سپاہیوں کی بہترین تربیت یافتہ فوج کو گھات میں چھپا رکھا تھا اور قاہرہ کے باشندے جو نئے نئے سپاہی بنے تھے اور جنہوں نے کبھی میدانِ جنگ کی صورت نہیں دیکھی تھی، اُن کی ایک فوج بنا کر تاتاری فوج سے ٹکرا دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئے سپاہیوں کی فوج پہلے ہی حملے میں خوفزدہ ہو کر واپس بھاگنے لگی۔ قتطِ بوغا نے ان کا تعاقب کیا۔ لیکن جب پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ترک سپاہی پیچھے سے تاتاریوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے آ رہے تھے۔ قتطِ بوغا نے زندگی میں پہلی بار اپنی فوج کی صفیں تتر بتر ہوتے دیکھیں۔ اس کے سپاہی حواس باختہ ہو کر بھاگ رہے تھے۔ فوج کے سرداروں نے اسے بھی بھاگ چلنے کا مشورہ دیا۔ مگر قتط بوغا نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہ کوئی ہولا کو خاں تک یہ خبر پہنچا دے گا کہ میں نے لڑتے لڑتے جان دی ہے خان کے لئے اس حقیر سی فوج کی شکست کی کیا اہمیت ہے۔ کیا مغل عورتوں نے سپاہی بچے جننے چھوڑ دیئے ہیں یا گھوڑیاں ہمارے شہسواروں کے لئے بچے نہیں دیتی ہیں؟

قتطِ بوغا نے ایک خندی فیصلہ کیا تھا۔ نتیجے میں گرفتار ہو گیا۔ جب اسے بیبرس کے سامنے پیش کیا گیا تو بیبرس نے اپنی عادت کے مطابق مذاق اڑاتے کے انداز میں پوچھا۔

"تم سب تاتاری بھیڑیئے خود کو ناقابلِ شکست سمجھتے رہے ہو۔

اس شکست کے بعد تمہارے دماغ کا فیصلہ کیا ہے؟"

قطبِ بوغا نے جواب دیا: "میں اپنی اس شکست کو تم مسلمانوں کی تباہی کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔ میرے مرنے کی خبر سُن کر ہولاکو خاں جلد ہی یہاں واپس آئے گا۔ پھر تمہاری تہذیب مغلوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے کچلی جائے گی۔ مغل شہسوار تمہاری عورتوں کو لے جائیں گے۔ پھر تمہاری عورتیں اپنی کوکھ سے مغل سپاہی پیدا کریں گی۔"

قطبوغا نے ہلاکو خاں کے بل پر جو ڈینگ ماری تھی، وہ پوری نہ ہوسکی اُس کا سر قلم کر کے ایک بانس پر نصب کر دیا گیا۔ مغل قیدیوں کو قاہرہ کی شاہراہوں اور گلیوں میں گھمایا گیا۔ پھر ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کر انہیں قتل کر دیا گیا۔

قاہرہ کے مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جن مغل تاتاریوں کو کبھی شکست نصیب نہیں ہوئی تھی، انہیں سر پھرے بیبرس نے شکست دے کر ایک ایک سپاہی کو ہلاک کر دیا تھا۔ صلیبی قوتیں اپنی اپنی جگہ گم صم تھیں۔ صلیبی پہلے ہی بیبرس کی لوٹ مار سے نالاں تھے۔ اب تو وہ ایک بہت بڑے لشکر کی قیادت کر رہا تھا اور انہیں سمجھا چکا تھا کہ کوئی اس کے اور ہلاکو خاں کے درمیان نہ آئے۔ اُن کے غیر جانبدار رہنے میں ہی ان کی بھلائی ہے اور وہ فی الحال اپنی بھلائی کے خیال سے خاموش تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں، اب ہلاکو خاں کیا قیامت ڈھاتا ہے۔

بیبرس کی اس فتح نے دوسری چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستوں میں ایک نئی زندگی اور شادمانی کی لہر دوڑا دی تھی۔ ایسے وقت بیبرس کو جو سب سے خوش آئند مبارکباد کا خط ملا، وہ برقائی خاں کی طرف سے آیا تھا۔

بہت پہلے بیبرس نے ایک تبلیغی جماعت بھیج کر روس کی سرزمین میں اسلام کا بیج بویا تھا، اب اُس کی فصل پک کر تیار ہوگئی تھی۔ چنگیز خاں کے ناجائز بیٹے جوچی خاں کے ایک بیٹے برقائی خاں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اُس نے اپنے خط میں بہت کچھ لکھا تھا۔ ہلاکو خاں کی ایک فوج کی شکست پر حیرانی ظاہر کی تھی۔ بیبرس کو فتح کی مبارکباد دی تھی اور بڑے فخر سے لکھا تھا کہ اب کوئی اسے ناجائز باپ کا بیٹا نہیں کہہ سکتا۔ اُس نے بھیڑیوں کا مذہب ترک کر دیا ہے اور مسلمان ہو کر ایک نیا جنم لیا ہے۔

یہ خط پڑھ کر بیبرس کو اپنے اندر ایک نئی قوت کا احساس ہوا۔ اس نے ایک سپاہی کے دماغ سے سوچ لیا کہ مغل تاتاریوں کے خلاف سب سے طاقتور حلیف برقائی خاں جیسا مغل تاتاری ہو سکتا ہے لوہے کو لوہا کاٹے گا۔ اس نے برقائی خاں کا پیغام لانے والے شہسوار ایلچی کی بڑی خاطر مدارات کی۔ اُن کے اعزاز میں کھیل تماشے اور دعوتیں کیں۔ ان میں سے چند شہسواروں کو اس مقصد کے لئے روک لیا کہ وہ اس کے سپاہیوں کو مغلوں کی جنگی ترکیبیں سکھائیں اور دوسروں کے ساتھ اپنے سفیروں کو برقائی خاں کی خدمت میں روانہ کرنے سے پہلے یہ اچھی طرح معلوم کر لیا کہ اسے کس قسم کے تحفے پسند ہیں۔ اس نے تحفتاً قرآن مجید کا ایک نسخہ بھیجا، جس کے جزدان پر سنہرا کام تھا۔

زر تار مصلّیٰ ہاتھی دانت اور صندل کا ایک مرصّع تخت اور ایک کلاہ جو مکۂ معظمہ میں حج کے زمانے میں پہنی گئی تھی۔ اُس نے برقائی خان کی طرف سے اپنے ایک افسر کو حج بیت اللہ کے لئے روانہ کیا۔ اس حد تک اسلامی نقطۂ نظر سے یہ تحفے قابل قدر تھے مگر بیبرس میں ایک بہت بڑی خرابی یہ تھی کہ جہاں وہ کٹّر مسلمان تھا، وہاں تھوڑا سا شیطان بھی تھا۔ اُس نے ان تحفوں کے علاوہ خواجہ سراؤں کا ایک دستہ بھیجا جن کے ساتھ بہت سے بندر ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور یہ کہلا بھیجا کہ یہ خان کی تفریح کے لئے ہیں۔ اگر خان نے انسانوں میں تیسری جنس نہیں دیکھی ہے تو خواجہ سراؤں کو دیکھ لے۔

اس نے شہسواروں سے یہ بھی معلوم کیا تھا کہ برقائی خان ذرا رنگین مزاج ہے۔ اس کے پیشِ نظر اس نے خان کی خدمت میں ایک سو عیسائی لڑکیاں روانہ کیں۔ اُن کے ساتھ یہ کہلا بھیجا کہ ہلاکو خان نے جہاں جہاں مسلمانوں کی بستیاں اُجاڑی ہیں، وہاں مسلمان عورتیں یا تو قتل کر دی گئیں یا اغوا کر لی گئیں لہٰذا خان ان عیسائی لڑکیوں کو مسلمان بنائے اور ثواب حاصل کرے۔

پھر اس نے اپنے ہاتھ سے خان کو ایک خط لکھا۔ خط کی ابتدا کچھ یوں تھی —
"ایک عاجز قپچاقی کا خط، قپچاقیوں کے خان کے نام ایک پکّے مسلمان کی طرف سے ایک طاقتور مسلم کے حضور میں" اس کے بعد اُس نے لکھا تھا کہ ہلاکو خان اسلام کو سرے سے نیست و نابود کرنے پر تُلا ہوا ہے اور یہ عاجز بیبرس اس کوشش میں مصروف ہے کہ خلافت کو از سرِ نو بحال کرے اور کافروں کے خلاف جہاد کرے۔

اُس نے یہ بھی لکھا کہ قاہرہ کی جامع مسجد میں خطبے کے دوران برقائی خان کا نام بھی لیا جائے گا۔ آخر میں اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ خان اس طرح مدد کر سکتا ہے کہ جب ہلاکو خان مصر کی طرف پیش قدمی کرے تو برقائی پیچھے سے اُس کی فوج پر حملہ کر دے۔

بیبرس نے سیاسی ضروریات کے پیشِ نظر بڑے دوستانہ لہجے میں وہ خط لکھا تھا۔ اس کا نتیجہ اچھا نکلا۔ پہلی بار چنگیز خاں کے خاندان کے ایک فرد برقائی خاں نے اپنے خاندان اور اپنی قوم کے خلاف ایک مسلمان اجنبی قوم کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اب وہ دونوں انتظار کر رہے تھے کہ دشت کا بھیڑیا اب تب میں غرّا کر ان کی طرف پلٹنے ہی والا ہے۔

تبریز کے بلند علاقے میں پہنچتے ہی ہلاکو خاں کے قدم رک گئے۔ فلسطین سے ایک قاصد نے آ کر یہ ناقابلِ یقین خبر سنائی کہ قط بوغا نے شکست فاش کھائی ہے اور قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کی فوج کے بوڑھے مغلوں نے کہا۔

"ہمارے دلوں پر چنگیز خاں کا قول نقش ہے کہ شکست صرف بزدلوں کا مقدر ہے۔ ہلاکو! تیری فوج کو شکست ہوئی ہے۔ تو ایک بزدل کا چہرہ لے کر وطن واپس نہیں جا سکتا۔"

دوقوزہ نے کہا۔ "میں پہلے ہی کہتی تھی کہ بیبرس کو ڈھیل دے کر وطن واپس جانا دانش مندی نہیں ہے۔ اب جو کچھ بھی ہوا ہے، اس سے سبق حاصل کر۔ قط بوغا کی موت کا بدلہ لینے کے لئے تجھے مصر کی طرف پلٹنا ہو گا۔"

اور وہ مصر کی طرف پلٹ گیا۔ اُسے اپنے خاقان منگو خاں کی باتیں یاد آگئیں، اس نے کہا تھا "ہولاکو اتو طاقت میں اور وقوزہ فراست میں افضل ہے اُس کی باتیں غور سے سُننا اور ان پر عمل کرتے رہنا"

اسے افسوس تھا کہ اُس نے اپنی محبوبہ کا مشورہ نہ مان کر اُس کا دل دُکھایا ہے۔ اُس نے وعدہ کیا کہ اس بار وہ اس کی شرط پوری کر دے گا۔ اُس نے پھر ایک بار بیبرس کو للکارنے کے انداز میں خط لکھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کوئی تاتاری قاصد خط لے کر جائے گا تو بیبرس اُسے قتل کر دے گا۔ اس خیال سے اس نے ایک مسلمان کو قاصد بنا کر روانہ کیا۔

ان دنوں بیبرس اپنا سکون کھو بیٹھا تھا۔ ہلاکو جیسے دشمن کو چھیڑنا اور للکارنا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ ہر وقت اُس کے حملے کا خارشہ لگا رہتا تھا۔

-------------شمال کی جانب جہاں سے وہ بھیڑیا آنے والا تھا، اُس کے راستے پر بیبرس نے کئی چوکیاں بنائی تھیں اور ہر چوکی میں ہوائی ڈاک یعنی نامہ بردار کبوتروں کا انتظام کیا تھا تاکہ کسی وقت بھی چنگیزی پرچم نظر آئے تو ہوائی ڈاک کے ذریعے فوراً اطلاع مل جائے۔

وہ ہلاکو سے ٹکرا جانے کے لئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ جہاں بھی پڑاؤ کرتا، ایک خیمے میں ایک رات سے زیادہ بسر نہ کرتا۔ سوتے وقت بھی سپاہیانہ لباس میں کیل کانٹوں سے لیس رہتا تھا۔ اس کا گھوڑا ابھی جس کی زین نہیں اُتاری جاتی تھی، تمام رات خیمے کے سامنے

مستعد کھڑا رہتا تھا۔ ایسے وقت ایک مسلمان قاصد ہلاکو خاں کا خط لے کر آیا۔
اس نے خط کو کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"ایک آنکھ والے شیطان! تیری حیات کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ اگر تو خود کو مسلمانوں کا محافظ سمجھتا ہے تو لاکھوں مسلمانوں کو میرے قہر و غضب سے محفوظ رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ ایک حقیر کیڑے کی طرح زمین پر گھسٹتے ہوئے میرے قدموں میں آ جا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ قاہرہ پہنچ کر میں مسلمانوں کا قتلِ عام نہیں کروں گا، اُن کی آنکھوں کے سامنے صرف تیری کھال کھینچوں گا۔ کیونکہ میری محبوبہ دو قوزہ تیری کھال کے بستر پر سونا پسند کرتی ہے۔"

خط پڑھتے ہی وہ قہقہے لگانے لگا۔ "ہاہاہا۔ وہ حسین عورت میری کھال پر سونا چاہتی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میرے متعلق اتنی دور تک سوچتی ہے۔ میں اُس کی خواہش ضرور پوری کروں گا۔"

اُس نے مضحکہ اُڑانے کے انداز میں قہقہے لگائے۔ لیکن سنجیدگی سے دوقوزہ کے متعلق سوچنے لگا کہ اگر وہ حسین ہے، جوان ہے تو ہلاکو خاں کو زبردست ذہنی صدمہ پہنچانے کے لئے اُس حسینہ کو اپنی آغوش میں سجانا ہی پڑے گا۔

وہ ہلاکو خاں کی مدتوں کا آرزو تھی۔ وہ بھی اُسے آغوش میں سجانے کے خواب دیکھتا آ رہا تھا۔ اُس نے مصر پر حملہ کرنے کے لئے جنوب کی طرف

بڑھتے ہوئے کہا۔ "دوقوزہ! یہ جنگی مہم میں تیرے نام سے منسوب کرتا ہوں۔ بہت جلد ہولاکو تیری خواہش کے مطابق تیرے لئے ایک خوبصورت سیج سجائیگا" یہ کہہ کر وہ اپنی فوج کے ساتھ آگے بڑھا۔ لیکن چند میلوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُسے رُک جانا پڑا۔ اُس کے پیچھے قفقاز کے درّوں سے برقائی خاں کی مغل فوج نمودار ہو رہی تھی۔

ہلاکو خاں تک یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ برقائی خاں اسلام قبول کر چکا ہے اور بیبرس اُس سے دوستانہ تعلقات استوار کر رہا ہے۔ لیکن وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ برقائی جنگ کے میدان میں بھی بیبرس سے دوستی کا ثبوت دے گا۔

اُس نے اپنا ایک قاصد برقائی کے پاس بھیجا اور اپنے خط میں لکھا۔

"برقائی خاں! چنگیزی خاندان کے کسی فرد نے آج تک کسی مذہب کو قبول نہیں کیا۔ لیکن تو مسلمان بن گیا۔ تیری یہ نادانی کسی طرح برداشت کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ حماقت برداشت نہیں کی جاسکتی کہ تو مسلمانوں کی حمایت میں میرے مقابل میدانِ جنگ میں آ گیا۔ کیا آج تک کبھی ایک مغل نے دوسرے مغل پر تلوار اٹھائی ہے؟ باز آجا برقائی! ورنہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔"

ہلاکو خاں کا قاصد یہ خط لے کر شام کو گیا تھا۔ اُس رات وہ واپس نہیں آیا۔ اُس رات ہلاکو خاں نے آسمان پر ایک دُم دار ستارہ دیکھا اس ستارے کی شکل ایک آتشیں مینار کی سی تھی۔ اچانک ہی ہلاکو خاں کا دل گھبرانے لگا۔

اُس کے عقیدے کے مطابق "مونگ کے تانیگری" اُس کے زوال یا تباہی کی نشانی دکھلا رہا تھا۔ وہ فوراً ہی سجدے میں گر پڑا۔ جوں جوں دُم دار ستارے کی روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی، اُس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

جب وہ سجدے سے اُٹھا تو بہت پریشان تھا۔ دوقوزہ نے اُسے سمجھایا۔ "تو دشت سے نکل آیا ہے تو نے شہری انسانوں کی تہذیب اور وسعت خیالی دیکھی ہے۔ یہ آسمان کسی کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ تو پرانے عقائد سے باز آجا۔ یہ دُم دار ستارہ تیری فتوحات کے آگے دیوار نہیں بنے گا۔"

ذرا سی دیر میں ہلاکو بیمار نظر آنے لگا تھا! اُس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "میرے باپ دادا نے اس ستارے کی نحوست سے انکار نہیں کیا۔ اُن کی زندگی کے تجربات میرے لئے پتھر کی لکیر ہیں۔ کیا تو نہیں دیکھ رہی ہے کہ ایک مغل دوسرے مغل کو للکارنے میدانِ جنگ میں آگیا ہے؟ اب سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ یہ یقیناً کسی بڑی تباہی کی طرف اشارہ ہے۔"

"کیا تو برقائی خاں سے ڈرتا ہے؟"

"بکواس مت کر۔" اُس نے گرج کر کہا۔ "ماورائی آسمان نے زمین پر کوئی ایسی طاقت پیدا نہیں کی ہے۔ جس سے ہولاکو ڈر جائے۔ برقائی جیسے جرائم کی اولاد کس گنتی میں ہے۔ ایک ہی حملے میں اس کی فوج پیچھے کھا گئے گی اور میں برقائی کا خیمہ جلا کر رکھ دوں گا۔"

"تو پھر خود کو سنبھالنے کی کوشش کر۔ فضول واہموں میں گرفتار

رہے گا تو کمزور سے کمزور دشمن بھی غالب آجائے گا۔ میں تیری تسلی اور اطمینان کے لئے قرا قرم سے سب سے بڑے شامان کو بلواتی ہوں۔ وہ اپنی روح کو "مونگ کے تینگری" کے پاس بھیجے گا اور تیری سلامتی کے لئے منحوس روحوں سے کوئی سمجھوتہ کرے گا۔"

ہلاکو اپنی محبوبہ کے اس مشورے سے متفق ہو گیا۔ اُسی وقت چند تیز رفتار سپاہی قرا قرم کی طرف روانہ کر دیئے گئے تا کہ وہ سب سے بڑے شامان کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ اس کے بعد دوقوزہ اس کی گھبراہٹ دور کرنے کے لئے اُسے شراب کے جام بنا کر دینے لگی۔

دوسری صبح اس کا قاصد برقائی خاں کا جواب لے کر آیا۔ ہلاکو نے خط کھول کر پڑھا۔ برقائی نے لکھا تھا۔

"ہلاکو۔ ! تو مجھے چنگیزی خاندان کا فرد کہتا ہے۔ اس کے باوجود تجھ سمیت چنگیزی خاندان کے تمام افراد مجھے ناجائز باپ کا بیٹا کہتے ہیں۔ تم سب میری اس پیدائشی کمزوری کو نہ بھول سکتے تھے اور نہ ہی ایک دادا کی اولاد سمجھ کر صدقِ دل سے مجھے گلے لگا سکتے تھے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں ایک بار پھر اس دنیا میں پیدا ہوتا۔ سو اسلام نے مجھے از سرِ نو زندہ کیا ہے۔ چنگیزی خانوادے کا برقائی خاں مر چکا ہے۔ اگر تو دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے تو میں تجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ تجھ جیسے وحشی بھیڑیئے کو میرا مذہب ہی انسان بنا سکتا ہے۔

اگر تو نے میری دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تو میری تلوار
اسلام کے تحفظ کے لئے اُٹھے گی۔ پھر جو پیش آنا ہے
پیش آئے گا۔ اور ہم کیا جانیں کیا پیش آئے گا، اس کا علم فقط
صرف خدائے ذوالجلال کو ہے۔"

یہ تحریر پڑھ کر ہلاکو خاں غصے سے تلملانے لگا کیونکہ برقائی نے خط کے آخری فقرے ٹھیک اسی کے انداز میں لکھے تھے۔ ہلاکو مسلمانوں کو دھمکی دینے کے لئے اپنے ہر خط کے آخر میں یہی لکھتا تھا کہ ہم کیا جانیں کیا پیش آئے گا، اس کا علم تو صرف "مونگ کے تینگری" کو ہے۔

دوقوزہ نے کہا۔" برقائی نے تیر اندازی اُڑایا ہے، پہلے اسی کا سر کچلنا چاہیئے۔"

ہلاکو نے یہی کیا۔ جنوب کی طرف جانے کے بجائے پلٹ کر شمال کی جانب بڑھا۔ اُن دنوں زبردست برفباری ہو رہی تھی۔ ہلاکو نے تیزی سے بڑھ کر حملہ کیا تو برقائی ذرا دیر مقابلہ کرنے کے بعد دریائے تیرک کے اُس پار بھاگنے لگا۔ یہ بیبرس کا مشورہ تھا کہ اسے بھاگنا چاہیئے۔ ہلاکو اس کی چال سے بے خبر تھا۔ اس نے دوقوزہ کو فوج کے ایک دستے کے ساتھ کنارے چھوڑ دیا۔ پھر اپنی تمام فوج کے ساتھ وہ دریا کی منجمد سطح کو پار کر کے برقائی کی فوج کا پیچھا کرنے لگا۔ اچانک ہی برقائی نے پلٹ کر حملہ کیا۔ اب تین طرف سے حملہ ہونے لگا کیونکہ دریا کے پار برقائی کے دوسرے فوجی دستے دائیں بائیں چھپے ہوئے تھے سہ طرفہ

حملوں سے ہلاکو کے سپاہی بوکھلا گئے۔ ہلاکو نے یہی مناسب سمجھا کہ واپس دریا کے پار جائے اور اپنے محاذ پر تازہ دم ہو کر دوسری ترکیب سے دوبارہ حملہ کرے۔ وہ مرد میدان زندگی میں پہلی بار پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔

اُس کی فوج تیزی سے دریا کی منجمد سطح کو پار کرنے لگی۔ ہزاروں سپاہی گھوڑوں پر سوار تھے۔ جب مسلسل گھوڑے دوڑنے لگے تو ان کی ٹاپوں سے برف کے تودے ٹوٹنے لگے۔ منجمد سطح کے نیچے سے پانی اُچھل کر دریا کو دو حصوں میں تقسیم کرنے لگا۔ بد قسمتی سے ہلاکو جس گھوڑے پر سوار تھا، اس گھوڑے کی پچھلی ٹانگیں ٹوٹے ہوئے تودے کے اندر دھنستی چلی گئیں۔ گھوڑا سنبھل نہ سکا اور ہلاکو خاں اُلٹ کر ٹھنڈے پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

اُس کے آگے جانے والے ایک فوجی افسر نے حاضر دماغی سے کام لے کر اس کی طرف ایک رسہ پھینکا۔ ہلاکو اُسے تھام کر سنبھل گیا، ڈوبنے سے بچ گیا مگر اُس کے افسر کے پاس اتنا موقع نہیں تھا کہ وہ اُسے اپنا گھوڑا پیش کر دیتا کیونکہ منجمد سطح ٹوٹتی ہی جا رہی تھی۔ وہ رسّے کے ایک سرے کو تھام کر اپنے گھوڑے کو آگے بھگاتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہلاکو رسّے کو تھامے گھسٹتا چلا گیا۔ کبھی وہ چکنی سطح پر پھسلتا جا رہا تھا۔ کبھی برف کے ٹوٹے ہوئے کناروں سے ٹکرا کر زخمی ہو رہا تھا۔ کنارے پہنچنے تک اس کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا، جہاں زخم نہ آئے ہوں۔

یہ حادثہ اس کی قوتِ برداشت سے باہر تھا۔ زخموں کی زیادتی اور سردی

کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو تمام جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بخار کی شدت سے اُٹھنے کے قابل نہ تھا۔ اُسے سمور کے لبادے میں لپیٹ کر رکھا گیا تھا۔ اُس سے افسر نے بتایا کہ اس جنگ میں وہ زبردست نقصان اُٹھا چکے ہیں۔ دریا کی منجمد سطح ٹوٹنے کے باعث اس کی آدھی فوج دوسرے کنارے رہ گئی تھی۔ پتہ نہیں برقائی خاں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ لیکن ایک اس سے بھی زبردست نقصان ہوا۔ ہلاکو خاں اس صدمے کو سہہ نہ سکا، نیم پاگل سا ہو گیا۔ اس کی دوقوزہ غائب ہو گئی تھی۔ دوقوزہ کی حفاظت کے لئے جو فوجی دستہ اس کنارے چھوڑا گیا تھا، اس کے نصف سے زیادہ سپاہی قتل کر دیئے گئے تھے اور باقی دوقوزہ کی طرح غائب تھے۔

صاف ظاہر تھا کہ بیبرس کٹیرا قیامت کی چال چل گیا ہے۔ ہلاکو خاں غصے کی شدت سے گرجنا چاہتا تھا۔ لیکن بیمار کے حلق سے صرف نقاہت بھری چیخ نکلی اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

فوجی دستے پر حملہ ہوتے ہی دو قوزہ خطرے کو بھانپ گئی۔ حملہ کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لئے محافظ دستے کے سپاہی ہلاک ہو رہے تھے یا پیچھے ہٹ رہے تھے۔ وہ فوراً ہی ہاتھ میں ننگی تلوار لیئے گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگنے لگی۔

کسی نے اُسے فرار ہونے سے نہیں روکا۔ جب وہ تلوار چلاتی ہوئی دشمنوں کے درمیان سے گزرنے لگی تو وہ پرے ہٹ کر جیسے اجی حملہ کرنے سے کترانے لگے۔ دو قوزہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ وہ دشمنوں کی صفیں چیرتی ہوئی جا رہی ہے۔ اُن کے حلقے سے نکل کر جب وہ تنہا رہ گئی تو اسے دُور اپنے سامنے ایک تنہا شہسوار نظر آیا۔

وہ ذرا ٹھٹھک گئی۔ سامنے والے شہسوار نے دائیں ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی۔ بایاں ہاتھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ دروقوزہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر تیزی سے اُس پر حملہ کرنے کے لئے لپکی۔ وہ بھی اس کی طرف آنے لگا۔ قریب پہنچتے ہی اُس کے بائیں ہاتھ میں تلوار نظر آئی۔ دروقوزہ ایکدم سے بوکھلا گئی۔ اُسے یاد آگیا کہ بائیں ہاتھ سے تلوار پکڑنے والا ہیبرساہی ہو سکتا ہے۔

سوچتے ہی سوچتے اس کی تلوار پر ایک کاری ضرب پڑی۔ اُس کا نازک سا ہاتھ جھنجھنا کر رہ گیا اور تلوار چھوٹ کر دُور زمین پر گر پڑی۔ اب وہ نہتی ہو گئی تھی۔ خیریت اسی میں تھی کہ جتنی تیزی سے وہ بھاگ سکتی ہے، بھاگتی رہے یہ محض اس کا خیال تھا۔ بائیں ہاتھ والا اُس سے بھی تیز رفتاری سے آرہا تھا۔

وہ قریب پہنچ کر قہقہے لگانے لگا۔ دونوں گھوڑے ایک ساتھ بھاگے جارہے تھے۔ دروقوزہ ایک ہاتھ چلا کر اُسے مارنے اور پرے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اُس نے ہاتھ پکڑ کر اُسے گھوڑے سے کھینچ لیا۔ وہ چیخیں مارتی ہوئی برفیلی زمین پر گھسٹنے لگی۔ شہسوار نے تھوڑی دور جا کر اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ دھپ سے برف کی ملائم سطح میں دھنس گئی۔

شہسوار گھوڑے کی لگام کھینچ کر واپس آنے لگا۔ وہ کراہتی ہوئی زمین پر سے اُٹھ رہی تھی۔ اپنے سامنے دشمن کو دیکھ کر وہ غصے سے ہانپنے اور غرانے لگی۔ وہ بائیں ہاتھ والا اُسے ایک آنکھ سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ غصے سے تلملاتی ہوئی بولی۔

"تو بائیں ہاتھ سے تلوار چلاتا ہے اور ایک آنکھ سے دیکھتا ہے، لہٰذا تم ہی بیبرس ہے۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں، میں کانا ہوں، اپنے خلوت میں آنے والی تمام حسیناؤں کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہوں اور ایک جیسا پیار بھرا سلوک کرتا ہوں۔ میں تیرے ساتھ بھی انصاف کروں گا۔"

"کیسا انصاف؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

"جیسا عیسائیوں نے ہماری عورتوں کے ساتھ کیا ہے۔ تو اور کیا توقع کرتی ہے؟"

وہ گھبرا کر بھاگنے لگی۔ بیبرس نے قہقہہ لگایا اور اس کے پیچھے گھوڑا دوڑاتے ہوئے کہا۔

"آگے آگے دوڑتی جا۔ مسلمان عورتیں بھی اسی طرح اپنی عزت آبرو کی خاطر تاتاریوں کے آگے بھاگتی اور فریاد کرتی تھیں۔"

وہ بھاگتے بھاگتے کہنے لگی۔ "میرا پیچھا چھوڑ دے، ورنہ پچھتائے گا۔ میں اُس بھیڑیئے کی محبوبہ ہوں جس کا نام سن کر مسلمان جنگلوں میں پناہ لینے کے لئے بھاگ جاتے ہیں۔"

اُس نے دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سے اُسے ایک لات رسید کی۔ بھیڑیئے کی محبوبہ برف کی بھُربھُری سطح پر دور تک لڑھکتی چلی گئی۔

بیبرس نے اس کے اطراف گھوڑے کو دُلکی چال چلاتے ہوئے کہا۔

"جنگلوں میں پناہ لینے والے مسلمان مر چکے ہیں۔ اب اسلام کے نام پر

ایک نئی قوم زندہ ہو رہی ہے۔ تو اپنی باتیں کر۔ مجھ سے دُور کیوں بھاگ رہی ہے۔ کیا میری کھال پر سونا نہیں پسند کرے گی؟"

وہ چونک کر خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات اس طرح بدل جائیں گے۔ جس کی کھال پر وہ سونے کی آرزو کر رہی تھی، اس کی ٹھوکروں میں پڑی ہوئی تھی۔

"خبردار!" وہ اپنی جگہ سے اُٹھتی ہوئی بولی۔ "مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ میں کوئی معمولی عورت نہیں ہوں۔ مجھے صرف ہلاکو جیسا شیر دل ہی جیت سکتا ہے۔"

اُس نے گھوڑے کو اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تو پھر دوڑ لگاتی جا۔ اگر تو ہلاکو کے پاس پہنچ گئی تو وہ تیرا ہوگا ورنہ تو میری ....."

وہ پھر بھاگنے لگی۔ بیبرس نے کہا۔ "تو مصر کی طرف بھاگ رہی ہے۔ وہاں مسلمان ہیں، تیرا ہلاکو دریائے تیرک کے پار گیا ہے۔ تجھے اُدھر جانا چاہیئے۔"

وہ ٹھٹھک گئی۔ بوکھلاہٹ میں وہ سمتوں کا تعین کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اُس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "بوکھلاہٹ میں یہی کیفیت ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے مسلمان بھی دشمن کو سامنے دیکھ کر گھبراہٹ میں بھٹک جاتے تھے۔ انہیں اتحاد کا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اب مغل تاتاریوں کا اتحاد ختم ہو گیا ہے۔ برقائی خان نے الگ ہو کر یہ زنجیر توڑ دی ہے۔ ہلاکو کی فوج میں انتشار پیدا ہو گیا ہے اور تو الگ بھٹک رہی ہے۔

چل بھگتی جا۔ ہو۔ ہاہا۔۔۔"

وہ بھیڑ بکریوں کے گلّے کی طرح اُسے ہانکنے لگا "ہو۔ ہاہا۔۔۔"

وہ ادھر سے اُدھر بھاگنے لگی۔ اُسے کہیں جائے پناہ نہ مل رہی تھی۔۔ وہ مسجدوں میں آگ لگوانے والی، ایک پیش امام کے جسم کی بوٹیاں کاٹ کر اس کے منہ میں بھرنے والی، عورتوں کو بیوہ، بچوں کو یتیم اور جوان عورتوں کا سہاگ لوٹنے والی، اسلامی سلطنتوں کو اجاڑ کر وہاں صلیب نصب کرانے والی بھاگ رہی تھی، گر رہی تھی، ہانپ رہی تھی، سنبھل رہی تھی۔ مگر کہیں صلیب کا سایہ نہ تھا کہ اُسے پناہ مل جاتی۔ آخر وہ بے دم ہو کر گر پڑی۔

اتنے میں ترک سپاہی فتح کا نعرہ لگاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔۔ انہوں نے کتنے ہی مغل تاتاریوں کو قیدی بنا لیا تھا اور نہ جانے کتنوں کو قتل کر کے چلے آئے تھے۔ بیبرس نے دوقوزہ کی جانب انگلی اُٹھا کر کہا۔

"اسے بھی قیدیوں کی طرح ہانک کر لے جاؤ۔ یہ دوڑتی رہے گی اور چلتی رہے گی۔ جب یہ تھک جائے، ہار مان جائے اور اطاعت قبول کرنے کے لئے راضی ہو جائے تو اس خوبصورت ناگن کو میرے خیمے میں پہنچا دینا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے محاذ کی طرف چلا گیا۔

وہ دن گزرنے لگا۔ شام کے وقت ہلاکو خاں کے محاذ پر ماتمی سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس کے فوجی افسر اپنے مفتوحہ علاقوں سے آنے والی امدادی فوجوں کا انتظار کر رہے تھے اور ہلاکو اپنے خیمے کے اندر نیم بیہوشی

کی حالت میں کراہ رہا تھا۔ جب رات کی تاریکی پھیلنے لگی تو اُس نے آنکھیں کھول کر نقاہت سے پوچھا۔

"دوقوزہ آ گئی ـــ؟"

جواب ملا کہ فی الحال دوقوزہ کو واپس لانا ممکن نہیں ہے۔ وہ دشمنوں کی قید میں ہے، اسے واپس لانے کے لیئے امدادی فوجوں کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن نقاہت سے زبان نہیں ہلتی تھی۔ آخر بڑی مشکلوں سے اس نے پوچھا۔

"کیا وہ منحوس ستارہ نظر ـــ آ رہا ہے......"

ایک افسر خیمے سے باہر گیا۔ اُس نے آسمان کی جانب دیکھا۔ پھر واپس آ کر بتایا کہ وہ دم دار ستارہ آج بھی نظر آ رہا ہے پھر اُسے تسلی دی گئی کہ پریشانی کی بات نہیں ہے، شاماں یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔ بار بار تسلیوں کے باوجود ہلاکو خاں کا چہرہ ایک مردے کی طرح سپاٹ اور ہر طرح کے جذبات سے عاری ہو گیا تھا۔ عیسائی طبیب اُس کا علاج کر رہے تھے لیکن فوجی افسران اس کی طرف سے مایوس ہوتے جا رہے تھے۔

دوسرے دن اس بیماری کی حالت اور بگڑ گئی۔ تیسرے دن بیبرس نے ایک تاتاری قیدی کو قاصد بنا کر بھیجا۔ قاصد ہلاکو خاں کے نام خط لے کر آیا تھا۔ بیبرس نے لکھا تھا۔

"ہلاکو! تیری دوقوزہ میرے خیمے میں پہنچ گئی ہے۔ اس حسینہ سے پتہ چلا کہ تو نے تیروں اور تلواروں سے فتوحات حاصل نہیں کی تھیں"

دو دو شیزہ کا ایک ایک بوسہ تجھے فاتح بنا تا رہا تھا۔ افسوس کہ تو
اپنی محبوبہ کے لئے میری کھال کا بستر نہ بنا سکا۔ حالات نے
پلٹا کھایا ہے، اب میں نے تیری محبوبہ کی کھال کا بستر بنا لیا ہے۔
فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی کھال زندہ ہے۔ کیا یہ المیہ تیرے
مرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔۔۔۔؟"

وہ خط پورا نہ پڑھا جا سکا۔ پڑھنے والے افسر نے دیکھا کہ ہلاکو خاں
سنتے سنتے گہری نیند سو گیا ہے۔ اب وہ جھنجھوڑنے سے بھی نہیں اٹھے گا۔

اس کہانی کے تاریخی پس منظر کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

تاریخ ابن خلدون
علامہ عبدالرحمن بن خلدون

تاتاریوں کی یلغار
ہیرلڈ لیم

تاریخ جہاں کشاں
علاؤالدین عطا الملک الجوینی

جامع التواریخ
رشید الدین

آخری سپاہی

گھوڑے نے کنوتیاں بدلیں تو ابو عامر نے چونک کر اطراف میں نگاہ ڈالی۔ پہاڑوں کے درمیان اس وقت وہ ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہا تھا۔

حساس گھوڑے کی رفتار میں جوں ہی قدرے کمی آئی کسی جانب سے سنسناتا ہوا ایک تیر ابو عامر کی طرف آیا۔

تیر پوری شدت سے ابو عامر کے بازو میں پیوست ہوا تھا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ سخت کھردری زمین پہ اچانک گرنے کی وجہ سے کافی چوٹیں آئی تھیں۔ مگر سخت جان ابو عامر چند لمحوں بعد کھڑا ہو گیا تھا۔ تیر کافی اندر تک پیوست تھا۔ تاہم اس نے درد کی شدت اور چوٹوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی مدد سے تیر کو پوری قوت سے کھینچ لیا۔

خون کا فوارہ تیر کے ساتھ ہی نکلنا شروع ہو گیا تھا۔

صبح صادق کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ اندھیرے کافور ہو رہے تھے، مگر اندلس کے مسلمانوں پر قسمت نے جو اندھیرے مسلط کئے تھے ان کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ ابو عامر نے جیسے تیسے عمامہ پھاڑ کر زخم کو باندھنے کی ناکام کوشش کی۔

مشکی گھوڑا چند قدم کے فاصلے پر رک گیا تھا۔ وفادار جانور اس عالم میں اپنے مالک کو تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ابو عامر کا اشارہ پا کر..... گھوڑے نے خوشی سے ہنہناتے ہوئے چند قدم آگے بڑھائے اور اس کے قریب آ گیا۔

وہ ٹھیک سے سوار بھی نہ ہو پایا تھا کہ بلنسیہ کے اس پہاڑی درے میں جہاں کچھ دیر پہلے زندگی کی کوئی علامت نہیں تھی متعدد انسانی چہرے نظر آنے لگے۔ یہ مسلح سوار تھے جو چاروں طرف سے نکل رہے تھے۔ غالباً رات کے کسی پہر میں یہ لوگ کمین گاہوں میں چھپ گئے تھے۔

سواروں کی تعداد بیس سے اوپر تھی اور سب کے سب اپنی وضع قطع سے نصرانی سپاہی معلوم ہو رہے تھے۔ ابو عامر کا دایاں ہاتھ بری طرح زخمی ہو کر ناکارہ ہو گیا تھا۔ سواروں کو قریب پا کر پرجوش نوجوان نے مدافعانہ جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"کوئی فائدہ نہیں نوجوان" ایک نصرانی سپاہی نے بڑی نخوت سے کہا۔ "مقابلہ کرنا بیکار ہے۔ اگر ہتھیار ڈال دو گے، تو ہم تمہیں گورنر ڈان کے

لو بر و پیش کر کے تمہاری سفارش کریں گے۔ وہ تمہاری جان بخش دے گا۔"

ابو عامر بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ اُس کی پشت پر ایک پہاڑی ٹیلہ تھا۔ حملہ آور سامنے سے حملہ کر کے اور رفتہ رفتہ گھیرا تنگ کر کے اسے مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ پشت پر پہاڑی ٹیلے کے برابر سے وہ خطرناک ڈھلان تھی جو ہزاروں فٹ گہرے کھڈ تک چلی گئی تھی۔ یہ ڈھلان اس قدر ناہموار تھی کہ کوئی شخص اس طرف سے نیچے اُترنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کسی سواری پر

بیٹھ کر اس طرف اُترنے کے معنی موت کو دعوت دینا تھا۔ ابو عامر نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈھلان پر ڈالی۔ پھر وہ اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو باتیں کرتا ہوا کافی آگے بڑھ آیا تھا۔ وہ اس حالت میں بھی ہمت ہارنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ نصرانیوں نے اسے دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر عین اس وقت جب ایک سوار آگے بڑھ کر حملہ کرنا چاہتا تھا، ابو عامر نے پہل کر دی۔ تلوار اس نے بائیں ہاتھ میں لے لی تھی۔ شاید حملہ آور اس کے لیئے تیار نہیں تھا۔ ابو عامر کا وار خاصا کاری پڑا۔ سوار گشتہ ہو کر نیچے گرنے لگا۔ اسی وقت نصرانیوں نے ابو عامر کی طرف ہلہ بول دیا۔ وفادار گھوڑا جو پوری صورت حال سمجھ چکا تھا اچانک ابو عامر کو لے کر ڈھلان کی طرف ہو لیا۔ مگر وہ چند قدم سے آگے نہ جا سکا۔ ابو عامر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ گھوڑا اور وہ دونوں ہی گہری کھائی کی طرف ڈھلان پر دور تک

لڑھکتے چلے گئے۔ نصرانی سپاہی ڈھلوان کے کنارے پر رک کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس طرف سے گرنے والوں کے لئے موت یقینی تھی۔ اس بات سے وہ کافی خوش نظر آ رہے تھے۔ اگرچہ ان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ نیچے جاکر ابو عامر کی لاش کو دیکھ سکتے۔ مگر اب وہ گورنر طراہ کو یقین دلا سکتے تھے کہ انہوں نے غرناطہ کے مجاہد حامد بن زہرا کے ساتھی ابو عامر کو ہلاک کر کے اس کا خاص مشن ناکام بنا دیا ہے۔

جنوبی اسپین میں ساحلِ سمندر سے بلنسیہ کو ملانے والی خلیج کے اس پار عمارہ اپنی بھیڑ بکریاں چرا رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ ملک کے اُفق پر اگرچہ مصائب کے بادل چھائے ہوئے تھے اندلس کی زمین دھیرے دھیرے مسلمانوں کے لئے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ سلطان الزغل کو اس کے سازشی وزیر ابو القاسم نے غرناطہ کے تاج و تخت سے محروم کر دیا تھا اور اس کے بھتیجے ابو عبداللہ کو باقاعدہ غرناطہ کا سلطان تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اندلس کے مسلمانوں کے لئے یہ ایک اندوہناک معاملہ تھا۔ مگر وہ بے بس ہو چکے تھے —— ابو عبداللہ ان کے دل جیتنے میں ناکام رہا تھا۔ طلیطلہ کی ملکہ ازابیلا اور اس کا شوہر فرڈی نینڈ دھیرے دھیرے مسلم علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے

جا رہے تھے - انہوں نے اندلس میں بہت سے ضمیر فروش لوگوں کو تیار کر لیا تھا جو مسلمانوں میں رہ کر ان میں بد دلی پھیلا رہے تھے - پھوٹ ڈلوا رہے تھے اور عیسائی حکمرانوں کے لئے راستہ ہموار کر رہے تھے -

ریوڑ میں سے چند بھیڑیں جدا ہو کر نہایت تیزی سے آگے بڑھ گئیں - عمارہ ان کا ارادہ بھانپ کر تعاقب کرنے لگی - بھیڑیں زقندیں بھرتی ہوئی دور دور تک پھیل گئی تھیں - یہ پہلا موقعہ تھا کہ عمارہ کی بھیڑوں نے اس قدر شوخی کا مظاہرہ کیا تھا - وہ بھی شوخی و شرارت میں ان سے کم نہ تھی قرب و جوار میں کوئی بھی نہیں تھا - عمارہ بھی خود کو ان کا ساتھی سمجھ کر ان کے پیچھے دوڑنے لگی -

خطرناک ڈھلوان کے پیچھے جہاں سپاٹ وادی کا علاقہ شروع ہوتا تھا وہ اچانک ایک جگہ ٹھٹھک کر رہ گئی - لطف کی بات یہ تھی کہ عمارہ کی بھیڑیں بھی اس سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ ٹھہر گئی تھیں بھیڑیں منہ پھیر پھیر کر عمارہ کی طرف دیکھ رہی تھیں - ان کے قریب ہی ایک گھوڑے کا کچلا ہوا جسم پڑا تھا -

ابو عامر کو اس نے پہلی نظر میں مردہ ہی سمجھا تھا - زخموں سے نڈھال انسانی ڈھانچہ عمارہ کے لئے تجسس اور دلچسپی کے لئے انسانی ہمدردی کی وجہ سے باعث افسوس ہوا تھا - کچھ سوچ کر لڑکی نے جھک کر نوجوان ابو عامر کو دیکھا - بکھرے ہوئے بالوں کے درمیان اس کا چہرہ لہولہان نظر آ رہا تھا - زخموں سے بڑی مقدار میں خون نکل گیا تھا - نوجوان بے ہوش تھا مگر

اس کی سانس چل رہی تھی۔

"یا اللہ۔ کیا کروں!" وہ بڑبڑانے لگی۔ "کاش یہ بچ جاتا۔" عمارہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اس ویرانے میں ایک نوجوان کی ایسی بے بسی اور ہلاکت نے اسے تڑپا دیا تھا۔ عمارہ نے یہ اطمینان کر کے کہ نوجوان ابھی زندہ ہے چاروں طرف اپنی مدد کے لئے کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس کی نگاہیں پہاڑوں اور ٹیلوں سے ٹکرا کر میدان میں دور تک پھیلتی گئیں مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اگرچہ خلیج اور اس کے کنارے آباد النورہ بستی یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھی وہ اپنے گھر سے اس وقت بھی بمشکل ایک میل دور تھی۔ مگر نازک اندام عمارہ ابو عامر جیسے گرانڈیل جوان کو کس طرح اٹھا سکتی تھی۔

کچھ سوچ کر عمارہ نے وادی کے ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر مہاجرین کی ایک نئی بستی آباد ہوئی تھی۔ یہ عیسائیوں کے ستائے ہوئے مسلمان لوگ نصرانیوں کے مقبوضہ علاقوں سے ہجرت کر کے غرناطہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن جب سے غرناطہ میں ابو عبداللہ نے اقتدار سنبھالا تھا۔ عام مسلمانوں میں بے یقینی اور مایوسی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ لوگ بھی بلنسیہ کے قریب ہی رک گئے تھے۔ یہاں سے انہیں خلیج کے ذریعے ساحل بربر کی طرف ہجرت کرنے کے مواقع موجود تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اسماء اپنے بھائیوں کے ساتھ کسی ضروری کام سے باہر آئی تھی۔ بستی کے باہر جب عمارہ نے اپنی سہیلی کو موجود پایا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔

مختصر الفاظ میں اس نے ابو عامر کے زخمی ہونے کا واقعہ سنایا اور اسماء سے مدد طلب کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ طاہر اور عماد جو بہن کے قریب ہی کھڑے تھے اور پوری بات سن چکے تھے اسی وقت عمارہ کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ جب یہ لوگ وادی کی طرف چلے تو منع کرنے کے باوجود اسماء ان کے ساتھ ہو لی۔

عماد کے مشورے پر گھوڑے اور بعض ضروری سامان ساتھ لے لیا گیا تھا۔ عمارہ کے لئے گھوڑے کی سواری شاید کسی اور وقت میں مصیبت بن جاتی مگر اس وقت وہ ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لئے اس قدر مضطرب تھی کہ بڑے آرام سے گھوڑے پر سوار ہو گئی اور پھر قافلہ تھوڑی دیر کے بعد اس وادی میں کھڑا تھا جو ایک پہاڑی ڈھلان کے اختتام پر شروع ہوتی تھی اور جس کا سلسلہ ایک طرف بلنسیہ تک پھیلا ہوا تھا اور دوسرا خلیج پر جا کر ختم ہوتا تھا جبکہ ایک سمت میں دور تک وادی کا حصہ تھا اور یہ شمالی علاقہ تھا۔ اس طرف سے بھی تھوڑا چکر لگا کر ساحل سمندر کے لئے راستہ مل جاتا تھا۔

عمارہ کی بھیڑیں اپنے مالک کی عدم موجودگی میں غالباً سہم کر ایک جگہ یکجا ہو گئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر پریشان لڑکی کو قدرے سکون ہوا۔ مگر اس وقت تو عمارہ کے دل میں اس زخمی نوجوان کو بچانے کے علاوہ کوئی دوسرا خیال ہی نہیں تھا وہ ہر قیمت پر اس کی جان بچانا چاہتی تھی۔ اگرچہ یہ جذبات اتنی شدت سے اس کے دل میں پہلی بار پیدا ہوئے تھے۔ مگر وہ ان کی توجیہہ کرنے سے قاصر تھی۔

قریب پہنچ کر طاہر نے گھوڑے پر سے زقند لگا کر اترنے میں پہل کی۔ اس کے بعد عماد اور دونوں لڑکیاں بھی اتر آئیں چاروں ایک حلقے کی شکل میں زخمی کے قریب کھڑے تھے۔ بالآخر عمارہ کو ہوش آ گیا۔ اس نے بعجلت تمام زخمی کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی اور چہرہ نبض کا اندازہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"خدا کا شکر ہے۔ یہ صرف بے ہوش ہے۔ شاید بچ جائے" عماد نے کہا۔

"مگر بھائی جان" طاہر بولا "خون کافی ضائع ہو چکا ہے"

"تو کیا۔ یہ۔ میرا مطلب ہے یہ اچھا نہیں ہو گا؟" عمارہ گھبرا کر بولی۔

"میرا خیال ہے کوشش کر لی جائے بھائی جان!" اسماء بجائے عمارت سے مخاطب ہو گئی۔

"یہ نوجوان معلوم ہوتا ہے اور اس عمر میں انسان کے ساتھ معجزے بھی ہوتے ہیں"

"ہاں۔" عماد جلدی سے بولا "واقعی اگر یہ بچ گیا تو۔ ضرور یہ ایک معجزہ ہی ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اب وقت ضائع نہ کیا جائے" زخمی ابو عامر کو جیسے تیسے کر کے بلنسیہ کے مضافاتی علاقے میں یعقوب کے گھر تک پہنچا دیا گیا۔ اگر عماد اور طاہر نہ ہوتے تو یہ مشکل کام ہرگز نہ ہوتا یعقوب کا مکان بستی کے کنارے پر سب سے الگ تھلگ تھا۔

یعقوب چمڑے کی مشکیں بنایا کرتا تھا۔ سیاست سے دور رہتا تھا لیکن عام مسلمانوں کی طرح وہ بھی دل سے ابو عبداللہ کو ناپسند کرتا تھا۔ عمارہ اس کی واحد اولاد تھی۔ بیٹی کو وہ آنکھوں کا تارا سمجھتا تھا۔ اسی لئے ایک پل کی جدائی بھی اسے شاق گزرتی تھی مگر جب عمارہ اس عالم میں گھر پہنچی کہ اس کے ساتھ ایک جاں بلب زخمی نوجوان تھا اور تین نوجوان اسے وہاں تک چھوڑنے آئے تھے تو یعقوب کے دل میں انسانی محبت کا دریا موجزن ہو گیا۔ اس نے مہمانوں کی تعریف کی اور انہیں احترام کے ساتھ گھر میں بٹھایا۔ عمارہ کے اس فعل پر باپ نے کسی خفگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ کافی حد تک سراہا۔ تو خوبصورت لڑکی خوشی سے کھل اٹھی۔ یعقوب نے ایک پڑوسی کو اسی وقت روانہ کر دیا تاکہ وہ کسی طبیب کو بلا لائے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر زخمی کو فی الفور طبی امداد نہ ملی تو اس کی جان جا بھی سکتی ہے۔

طبیب کے آنے تک ظاہر، یعقوب، عمارہ اور اسمار ابو عامر کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ تجربہ کار اور عمر رسیدہ یعقوب نے زخمی کو ابتدائی طبی امداد دینے کے بعض طریقے اپنائے۔ اس طرح جب طبیب یعقوب کے گھر میں داخل ہوا تو ابو عامر کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں صاف کر دیئے گئے تھے۔ گرد و غبار کی تہہ جو اس کے گرانے کی چوٹوں نے اس کے پورے وجود پر مسلط کر دی تھی وہ ایک حد تک ختم ہو گئی تھی۔ عمارہ اور اسمار نے یعقوب کی ہدایت پر اس دوران زخمی کو صاف ستھرا کرنے کے علاوہ جیسے تیسے کر کے گرم دودھ کا ایک پیالہ بھی حلق میں ٹپکا دیا تھا۔ شاید اس دودھ کا اثر تھا کہ

ابو عامر کے تنفس میں پہلے سے کچھ بہتری آ گئی تھی۔

سن رسیدہ طبیب کوئی نصف گھنٹے تک ابو عامر کا معائنہ کرتا رہا۔ اس دوران وہ سب ہی دم سادھے کھڑے تھے۔ سب کے دل دعاؤں سے لبریز تھے۔ نہ جانے کیوں انہیں اس اجنبی سے اس قدر ہمدردی ہو گئی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابو عامر ایک تندرست و خوبصورت نوجوان تھا۔ لباس سے ہی مسلمان نظر آتا تھا اور غالباً سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ دیارِ غیر میں اس کسمپرسی کا شکار ہوا تھا۔

"شدید چوٹیں آئی ہیں اور خون بھی خاصا ضائع ہو چکا ہے۔"

طبیب سیدھا کھڑا ہو کر بولا۔ اب وہ تیمارداروں سے مخاطب تھا جو اب تک زخمی کی چارپائی کے چاروں طرف قدرے جھکے ہوئے کھڑے تھے۔ طبیب کی بات کا جواب یعقوب نے دیا۔

"محترم۔ مجھے امید ہے کہ ایک انسان اور پھر برادرِ مسلمان کو بچانے کے لئے آپ کوئی دقیقہ نہیں چھوڑیں گے۔"

طبیب نے سر کو اثبات میں جنبش دی مگر وہ نہایت سنجیدگی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ حاضرین اُس بوڑھے حکیم کو دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ اب وہی انہیں ابو عامر کے بارے میں وثوق سے کچھ بتا سکتا تھا۔

"بابا۔ یہ بچ تو جائے گا نا۔" بالآخر عمارہ کے منھ سے نکل ہی گیا۔ وہ زیادہ دیر تک خاموشی برداشت نہ کر سکی۔ عمارہ کی مترنم آواز پر سب ہی چونک پڑے۔

"خدا کی ذات سے نا امیدی کفر ہے بیٹی" طبیب اس کی طرف مڑ کر بولا۔ "بلا شبہ نوجوان موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مگر خدا کو فضل کرتے دیر نہیں لگا کرتی۔"

اسماء اس دوران اگرچہ بالکل خاموش کھڑی تھی اور سب سے چہرے تک رہی تھی مگر نہ جانے کیوں اس کا دل سینے میں زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ جب سے ابو عامر یعقوب کے گھر میں آیا تھا اور صاف ستھرے بستر پر لیٹا تھا اسے یہ چہرہ اجنبی سا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر اسماء کو یہ بھی یاد نہیں آیا تھا کہ اس نے اجنبی نوجوان کو کب اور کہاں دیکھا ہے۔

"کم از کم دو مہینے اس کی خصوصی نگہداشت اور علاج کرنا ہو گا۔" طبیب نے غور و فکر کے بعد کہا۔ "اس دوران زخمی کو اسی جگہ رکھا جائے ورنہ کسی سفر کی وجہ سے مزید ابتری کا امکان ہے۔"

"ابا۔ ہم اس کا علاج بھی کرائیں گے اور تیمارداری بھی کریں گے۔" عمارہ نے امید بھری نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ یعقوب بھی اس بات سے متفق نظر آ رہا تھا۔ مگر اس نے بیٹی کو نظر انداز کرتے ہوئے طبیب کو مخاطب کیا۔ "محترم۔ میں اس نوجوان کو ہر قیمت پر بچانے کے لئے تیار ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اور یوں بھی ایک مسلمان اور ایک انسان ہونے کے ناطے سے ہمیں ایسے نازک وقت میں ایک دوسرے کے کام آنا چاہیئے۔"

"قابل مبارکباد ہیں آپ" حکیم نے اس فراخدلی پر یعقوب کی تعریف کی۔

بلکہ چوبیس گھنٹے دوا پلانی ہو گی۔ اور دیکھ بھال ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ کام آسان نہیں ہے اور صرف ایک آدمی کے بس کا بھی نہیں۔" طبیب کی بات ختم ہوئی تو وہاں موجود ہر شخص خود کو تیمارداری کے لیئے پیش کر رہا تھا۔

"اب میرے لیئے فیصلہ کرنا آسان بھی ہے اور دشوار بھی۔" بوڑھا حکیم مسکرایا۔ "دوائیں تو میں دے دوں گا لیکن ایک ہفتے تک دم دم کی خبریں مجھ تک آنی چاہیئیں۔ اس کے علاوہ بلاناغہ صبح کو مریض کا معائنہ کروں گا۔ بوڑھا آدمی ہوں بہتر ہوگا کہ آپ اس کام کے لیئے کسی نوجوان کو مقرر کر دیں۔"

عمّارہ اور طاہر دونوں ہی اس کام پہ بضد تھے مگر یعقوب نے صرف طاہر کا انتخاب کیا۔ وہ اسمارہ کو بھی واپس کرنا چاہتا تھا مگر طبیب نے ہدایت کی کہ ابھی کم از کم دو ہفتے ان دونوں لڑکیوں کی ضرورت ہو گی اور انہیں کم از کم چار چار گھنٹے دن رات ڈیوٹی دینی ہو گی۔ صرف اسی طرح نوجوان کو بچانے کی کچھ تدبیریں ہو سکتی ہیں۔

یعقوب نے عمّارہ کو ناشتہ کرا کے اس توقع کے ساتھ واپس کیا کہ وہ گھر جا کر اپنے والدین کو ان حالات سے باخبر کر کے اس بات پر رضامند کر ے گا کہ وہ اسمارہ کو ان کے گھر پر ٹھہرنے کی اجازت دے دیں گے۔ یوں بھی یعقوب کے گھر میں دو افراد ہی تھے ایک سن رسیدہ یعقوب اور دوسری نوعمر عمّارہ۔ پھر طاہر کو بھی روک لیا گیا تھا۔ اس طرح عمّاد مطمئن تھا کہ اس کے والد کو ان حالات میں اس بات سے کوئی اختلاف نہ ہو گا۔ یوں بھی صالح ان مہاجرین میں سے تھا جو اپنا سب کچھ لٹا کر غرناطہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور

ہوتے تھے اور اب اپنی دنیا آپ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انہیں ابوعبداللہ
یا اس کے مقرر کردہ بلنسیہ کے گورنر عبدالرحمٰن سے کوئی ذاتی رنجش تو نہیں تھی۔
مگر حالات نے کچھ ایسے شواہد پیش کئے تھے جن سے من حیث القوم ابو
عبداللہ کی نالائقی اور اس کے عمال کی ذریدہ ذہنی منظر عام پر آچکی تھی۔

نصرانی سپاہیوں کا مختصر دستہ مالقہ کی طرف تیزی سے سفر کر رہا تھا۔ دستے میں اب انیس افراد رہ گئے تھے۔ وہ مالقہ سے گورنر ڈران مورہ کی خصوصی ہدایت پر بلنسیہ آئے تھے اور بلنسیہ کے مسلمان گورنر عبدالرحمٰن نے ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا تھا۔ انہیں بلنسیہ میں بعض جاسوس اور رہبر مہیا کئے گئے تھے اور اطراف کا مکمل طور سے جائزہ لینے کے بعد یہ طے پایا تھا کہ وادی الکبیر جانے والے قاصد ابوعامر کو بلنسیہ کے اس خوفناک پہاڑی علاقے میں قتل کر دیا جائے۔ اس طرح وہ اسپین کے اس مجاہد اعظم حامد بن زہرا اور اس کے دست راست عبید کو نفسیاتی طور پر یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اب اندلس میں مسلمانوں کے لئے کوئی جائے

پناہ نہیں۔

ابوعبداللہ کی آرام طلبی اور سازشی وزیر اعظم ابوالقاسم کی ریشہ دوانیوں نے پورے اندلس میں بڑی تعداد میں ضمیر فروش تلاش کر لئے تھے اور یہ بد نصیب لوگ محض زر اور زمین کے لالچ میں اپنی قوم، اپنا مذہب اور اپنی عادت و وطن کا سودا کر رہے تھے۔ فرڈی نینڈ اور ملکہ ازبیلا کے لئے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ شاہ الفانسو نے جو خواب دیکھا تھا اور بالآخر طیطلہ کے مسلمان گورنر یحییٰ کو ورغلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جس کے صلے میں نصرانیوں کو اندلس میں طیطلہ جیسے اہم مقام پر کنٹرول حاصل ہو گیا تھا۔ بعد میں بھی ان کی تگ و دو برابر جاری رہی اور دھیرے دھیرے وہ اسپین کے مغربی اور بعض شمالی و جنوبی علاقوں پر قابض ہو گئے تھے۔ ان میں اشبیلیہ فوجی اہمیت کا ایک اہم مقام تھا اور یہ بھی اب نصرانیوں کے پاس آ چکا تھا۔ انہوں نے مزید پاؤں پھیلانے کی ٹھانی تھی۔ مالقہ بھی ان کے زیر نگیں آ چکا تھا۔ اس طرح اندلس کا نقشہ دھیرے دھیرے کافی بدل چکا تھا۔ مسلمان جو فاتح اعظم طارق بن زیاد جیسے جرنیل کی سرکردگی میں اس شان سے اسپین میں داخل ہوئے تھے کہ طارق نے جبل الطارق کے قریب سمندر کو عبور کرنے کے بعد کشتیاں جلا دی تھیں۔ اس کے یہ الفاظ اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔

"مسلمانو! آگے بڑھو۔ فتوحات تمہاری منتظر ہیں اور یاد رکھو کہ اب تمہارے لئے واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے"

نصرانیوں کی فتوحات اگرچہ سازشیوں کا نتیجہ تھیں لیکن اسپین کے مسلمان

دھیرے دھیرے سمٹ کر ساحل سمندر یعنی وادی الکبیر کی طرف پناہ لینے پر مجبور تھے۔ تاہم اب بھی ان کے پاس ایک بہت بڑا علاقہ موجود تھا۔ انکے پاس غرناطہ جیسا شہر اور الحمراء جیسا قصر موجود تھا جو چودھویں صدی عیسوی تک پوری دنیا کے لئے فن تعمیر کا ایک مثالی نمونہ تھا۔ قرطبہ ان کے پاس تھا جہاں عالی شان محلات کے علاوہ نفیس قسم کے حمام اور مسافر خانوں کے علاوہ وہ عظیم الشان مسجد بھی تھی جو آج تک اپنے عظیم معماروں کے فن و عظمت کی گواہ ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل کا یہ زمانہ اندلس کے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے لئے سم قاتل ثابت ہوا تھا۔ ان میں سے الزغل جیسے عظیم سلطان کو بے آبرو ہونے پر مجبور کیا گیا تھا۔ موسیٰ اور الزیغری جیسے جیالوں کو روپوشی پر اکتفا کرنا پڑا تھا۔ خدا جانے ان بہادروں نے کس انداز میں مادر وطن کو الوداع کہا تھا۔ خدا جانے کس طرح انہوں نے اندلس کی خاک پر اپنے خون کا آخری قطرہ بہایا تھا۔

ڈان مور گورنر مالقہ نے چند روز پہلے ہی ایک قاصد کے ذریعے عبد الرحمان والیٔ بلنسیہ سے خفیہ طور پر سارے معاملات طے کر لئے تھے۔ اس قاصد کے ساتھ مالقہ سے ڈان نے بہت سی دولت اور حسین ترین عورتیں بھی بلنسیہ روانہ کی تھیں۔ قاصد کا مشن پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ مگر ڈان مور نے جس توقع پر یہ دستہ روانہ کیا تھا وہ پوری نہ ہو سکی۔ یہ دستہ جو ایک آزمودہ کار افسر جونس کی معیت میں بلنسیہ روانہ کیا گیا تھا۔ دو دن پہلے خاموشی سے رات کے وقت پہاڑی علاقے میں آکر چھپ گیا تھا۔ جونس نے

بڑی فراغت سے پورے علاقہ کا جائزہ لے کر غرناطہ جانے والے راستے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ جاسوس کی اطلاع کے مطابق اندلس کے مسلمانوں کی خفیہ تحریک کا حال ہی میں ایک اجلاس قرطبہ میں ہوا تھا اور وہاں جو کچھ لائحہ عمل طے پایا تھا اس سے مرکز کو اطلاع کرنے کے لئے اور آئندہ اقدامات کی توثیق کے لئے ایک شخص کو مقرر کیا گیا تھا کہ وہ خصوصی مراسلہ لے کر غرناطہ جائے جہاں حامد بن زہرہ اور اس کے ساتھیوں سے ملاقات کر کے اہم اطلاعات ان تک پہنچا دے۔ نیز مرکز کے خاص احکامات لے کر واپس آتے۔ اس کام کے لئے ابو عامر جیسے پرجوش نوجوان کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مگر یہ بھی اتفاق تھا کہ ابو عامر زخمی ہونے کے باوجود بچ گیا اور آخر وقت تک مقابلہ کرنے کی نسبت سے اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ دوسرا عجیب اتفاق یہ تھا کہ دستے کا ہلاک ہونے والا واحد سپاہی خود جوشی تھا جو یہ سوچ کر قدرے شیر ہو گیا تھا کہ ابو عامر زخمی ہے اور اس کے بیس ساتھیوں کی وجہ سے مرعوب ہو چکا ہے۔ اور یہی اس کی وہ بھول تھی جس کی وجہ سے جوشی کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔

نصرانیوں کا دستہ شب و روز سفر کر رہا تھا۔ انہوں نے جان بوجھ کر دشوار گزار راستوں کا انتخاب کیا تھا ورنہ انہیں مسلمانوں کے بہت سے علاقوں سے گزرنا پڑتا۔ اس طرح بہت ممکن تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو جاتے۔ مالقہ میں داخل ہو کر ان کی جان میں جان آئی۔ دستے کے سپاہیوں نے سفر کے دوران ارسلان کو اپنا سردار چن لیا تھا۔ اب

ارسلان اور اس کے ساتھی قلعہ مالقہ کے دروازے پر کھڑے تھے اور جب گورنر کی طرف سے اجازت مل گئی تو وہ سب کے سب دل ہی دل میں لرزتے ہوئے ڈان مور کے سامنے پہنچ گئے۔ مشن ناکام رہا تھا۔ سب کے چہرے بجھے ہوئے تھے۔ ڈان ایک ایک کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان کے سجدہ ریز ہو کر سلام کرنے کی کوئی خاص پذیرائی نہیں کی۔ جب وہ باادب جھک کر ایستادہ ہو گئے تو گورنر نے کڑک کر پوچھا۔

"کیا بات ہے تم لوگ خاموش کیوں ہو اور جونس کہاں ہے؟"

جملہ ختم کر کے ڈان نے برابر میں بیٹھی ہوئی اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظر مالقہ کے آرک بشپ پادری یوحنا پر چلی گئی سن رسیدہ پادری غور سے سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

"حضور" ارسلان نے عاجزی سے کہنا شروع کیا۔ "ہم ناکام لوٹے ہیں۔ مگر یہ ناکامی پوری ناکامی نہیں ہے۔"

"اس سے تیرا کیا مطلب ہے۔ صاف صاف بات کر۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔" گورنر نے ارسلان کو ڈانٹ کر تفصیل بتانے کو کہا۔

"عالی جاہ!" وہ گڑگڑا کر بولا "ہم وقت پر بلنسیہ پہنچ گئے تھے وہاں کے عامل نے بھی ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ ایک رات قبل ہم اس علاقے پر قابض تھے جہاں سے مسلمانوں کے قاصد کو گزرنا تھا۔ یہ واحد راستہ اس جگہ نہایت خطرناک ہو جاتا ہے۔ تاہم ہمارے

لئے وہاں بہترین کمین گاہیں موجود تھیں۔ افسوس کہ قاصد سے ہماری مڈبھیڑ علی الصبح ہوئی۔ ہمارے ایک سپاہی کے تیر نے اس کے دائیں ہاتھ کو چھید ڈالا تھا اور وہ تقریباً بیکار ہو گیا تھا۔ مگر اس شخص نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش نہیں کیا اور جب اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تو گہری ڈھلوان کی نذر ہو گیا۔ اس دوران جونس نے بھی اس کے تعاقب میں گھوڑا بڑھا دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی کام آ گیا۔

ارسلان نے واقعات کو ایک حد تک بدل کر گورنر کے سامنے پیش کیا تھا مگر وہ اپنی تقدیر کے لکھے کو کس طرح مٹا سکتے تھے۔ ڈان ایک سخت مزاج انسان تھا۔ اس نے دانت پیس کر ان کی طرف دیکھا۔ پھر پادری سے مخاطب ہوا۔

"آپ کے خیال میں محترم باپ۔ ان کے لئے کیا سزا ہونی چاہیئے؟"

آرک بشپ۔ گورنر سے بھی زیادہ دل برداشتہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ان شوریدہ سروں کی گردنیں اڑانے کا مشورہ دیا۔ گورنر ڈان مورے نے مقدس پادری کا مشورہ فوراً مان لیا۔ سپاہی ننگی تلواروں کے سائے میں ان بدنصیبوں کو جب دربار سے لے گئے تو گورنر نے غور سے پادری یوحنا کی طرف دیکھا۔ آرک بشپ منہ ہی منہ میں کچھ مقدس دعائیں پڑھنے لگا تھا۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوا تو گورنر کی اہلیہ میری نے پادری کو مخاطب کیا۔

"مقدس باپ۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے آدمی اس قدر زریں مواقع گنوا رہے ہیں۔ آپ آسمانی باپ سے ان لوگوں کے حق میں دعا کریں۔"

"آسمانی باپ اور اس کے مقدس بیٹے نے یقیناً ہمارے لئے فتوحات کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ مگر وہ قوم جو اپنے معاملات میں ذہن و بصیرت کو استعمال نہیں کرتی کبھی سُرخ رُو نہیں ہو سکتی۔"

"آپ کے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے محترم بزرگ؟" گورنر ڈراں نے کہا۔

"کیا تم چند مولد سکوز مہیا کر سکتے ہو ڈراں؟" پادری یوحنا نے پوچھا۔

"یہ تو کوئی مشکل نہیں جناب" ڈراں نے جواب دیا۔ "کئی ایسے مسلمان ہیں جو اب دل سے عیسائی ہو چکے ہیں اور منافق مولد سکوز سے الگ تھلگ رہ کر ان کے خلاف جاسوسی بھی کرتے ہیں۔ میں انہیں آپ کے پاس بھیج سکتا ہوں۔"

ڈراں مود۔ نے اپنے خاص خدمت گار کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا جو اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا اور اس کی طرف متوجہ تھا۔ خادم اشارہ پا کر چند قدم آگے بڑھ آیا۔

"ابوالقاسم کے آدمی کو پیش کیا جائے" ڈراں نے اسے حکم دیا۔ خادم فوراً ہی اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔

"شاید کوئی خاص پیغام آیا ہے غرناطہ سے۔۔؟" پادری نے دریافت کیا۔ "کیا یہ قاصد وزیر اعظم ابوالقاسم نے کسی خاص مقصد سے روانہ کیا ہے؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے محترم" جان بوجھ کر گورنر تفصیل نہیں بتا رہا تھا۔
گورنر کی اہلیہ میرگا بھی معنی خیز طور پہ خاموش بیٹھی تھی۔
تھوڑی دیر بعد ایک قد آور شخص جو لباس سے امیر کبیر مسلمان معلوم ہوتا تھا، ان کے روبرو پہنچ گیا۔ مہمان کو لے کر آنے والے سپاہی ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔

"خوش آمدید۔ مصعب۔ ہم تمہارا استقبال کرتے ہیں" ڈان مورینہ سب کی طرف سے ابوالقاسم کے فرستادے کا خیر مقدم کیا۔

"ہمارا محل میں آرام کرنے سے سفر کی کلفت اب ختم ہو گئی ہو گی؟" ڈان نے پوچھا۔

"اب بہت بہتر ہوں" مصعب بولا "دراصل میں نے مسلسل سفر کیا ہے، اس وجہ سے کئی راتوں تک سو بھی نہیں سکا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں بروقت پہنچ گیا"

"مجھے یقین ہے تم ضرور ہمارے دوست کا کوئی خاص پیغام لائے ہو گے" ڈان نے پوچھا۔

"یقیناً جناب۔ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ وزیر موصوف کو مجھے روانہ کرنا پڑا۔"

"ہم بصد شوق وہ معاملات سننا پسند کریں گے دوست"
ڈان کی بات سن کر مصعب نے حاضرین کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"تم ان کے سامنے کہہ سکتے ہو یہ ہماری اہلیہ میری کی ہیں اور یہ محترم پادری یوحنّا۔"

مصعب پوری طرح اس بات سے مطمئن نہیں تھا مگر وہ عیسائی گورنر سے اختلاف کرنے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ لباس کے خفیہ حصّے میں ہاتھ ڈال کر قاصد نے ایک مراسلہ نکالا اور وہ بڑے ادب سے ڈان مور کو پیش کر دیا۔

"کیا لکھا ہے ذرا بلند آواز سے پڑھو ڈان مور۔" یوحنّا بے چینی سے بولا۔

ڈان مور بلند آواز سے خط پڑھنے لگا۔

"تمہارے ایک وفادار دوست کا یہ پیغام جس وقت آپ کے پاس پہنچے گا اس وقت تک بہت ممکن ہے کہ غرناطہ کی خفیہ مسلم تنظیم کوئی اہم فیصلہ کر لے۔ یہ لوگ قرب وجوار کی غیر مسلم آبادیوں کو تاخت وتاراج کر دینا چاہتے ہیں اور باقی ماندہ عیسائیوں کو جبراً مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس کے جواب میں ہے کہ اہلِ غرناطہ کے خیال میں عیسائیوں نے مقبوضہ علاقوں میں جبراً مسلمانوں کو اصطباغ دے کر مورسکو نز بنا لیا ہے۔ آپ کے اس خادم کا یہ خیال ہے کہ اگر جلد سے جلد خفیہ تنظیم کو ختم نہ کیا گیا تو حصولِ مقصد میں بہت سی دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، خفیہ تنظیم کا دفتر غرناطہ میں ہے اور یہ خاکسار ان میں سے بعض ممبران سے کسی نہ کسی طرح مل بھی چکا ہے۔ مگر یہ لوگ حلف اٹھا کر اس گروہ میں شامل ہوئے ہیں اور ان کے عزائم بے حد خوفناک ہیں۔ یہ اندلس سے

عیسائیوں کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں۔ گروہ میں ہزاروں افراد شریک ہو چکے ہیں مگر چند لوگوں کے علاوہ کسی کو بھی اس خفیہ تنظیم کے صدر مقام کا علم نہیں ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ بات حکومت کے علم میں بھی آچکی ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ابو عبداللہ آپ لوگوں سے ٹکرانے کی اپنے اندر سکت نہیں پاتا مگر وہ خفیہ تحریک کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ممکن ہے وہ اس گروہ کو اپنے حق میں مفید سمجھتا ہو۔

عالی جاہ! میں نے سر توڑ کوشش کے بعد یہ کوائف جمع کئے ہیں اور اپنے خاص فیصلے پر پہنچ سکیں۔ میری ناچیز رائے میں اب آپ کے لئے براست اقدام کرنے کا وقت آ گیا ہے غرناطہ کے وفادار کہیں روپوش ہو چکے ہیں اور بہت سے لوگوں کو آپ کے حق میں خریدا جا چکا ہے۔ یہ لوگ اپنے اپنے علاقے میں آپ کے لئے بڑے مفید کام انجام دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس علاقے کے مسلمانوں میں مایوسی پھیلانا اور حکومت سے بدظن کرانا ان ہی لوگوں کا کارنامہ ہے۔ اب ہزاروں خاندان اندلس سے ہجرت کر کے افریقہ جانے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ آپ کے لئے طالع آزمائی کا یہ ایک سنہری موقع ہے۔

میں یقین دلاتا ہوں کہ اس اہم لیکن خطرناک کام کو شب و روز اس سے بھی زیادہ تندہی کے ساتھ سرانجام دیا جاتا رہے گا۔ تاہم مالی وسائل کے سلسلے میں مجھے آپ کی مدد درکار ہے"

گورنر ڈان مور نے خط پڑھ کر اپنی اہلیہ کی طرف بڑھا دیا لیکن پادری لوحنا

نے اسے درمیان سے ہی لے لیا۔ ڈان مور اب مصعب کی طرف مخاطب تھا۔

"تمہارے خیال میں کیا واقعی اب راست اقدام کا وقت آگیا ہے؟"

گورنر نے مصعب کی طرف دیکھ کر کہا۔ گر ان ڈیل قاصد ابوالقاسم کا دوست راست تھا اور تمام حالات سے باخبر بھی تھا۔ اس نے اثبات میں سر کو جنبش دیکر جواب دیا۔

"وزیر اعظم نے میرے خیال میں بالکل درست فرمایا ہے۔"

ڈان مور نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔ "اگر ہم لشکر کشی کا فیصلہ کر لیں تو ابتدا کہاں سے کی جائے اگرچہ یہ فوجی اہمیت کا سوال ہے اور اس کے بارے میں وقت پر ہی کچھ فیصلہ کیا جا سکتا ہے تاہم اس ضمن میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"آپ نے بالکل درست فرمایا۔ جہاں تک میری ناچیز رائے کا سوال ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو سب سے پہلے بلنسیہ کا رخ کرنا چاہیئے۔ شمال کے اس اہم فوجی علاقے کو زیر نگیں کرنے سے آپ کے لئے وادی الکبیر تک آگے بڑھنے کے مواقع حاصل ہوں گے البتہ عیسائیوں کو الغبارہ اور غرناطہ کے ان قبائل سے چوکنا رہنا ہوگا جو آخری دم تک مزاحمت کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔"

ڈان مور اور میری بغور اس کی باتیں سن رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے مصعب کے صائب مشورے کی دیر تک تعریف کی اور گورنر کے حکم پر اسی وقت مہمان کے لئے خصوصی انعام واکرام کا انتظام کر دیا گیا۔

مصعب کو دوسرے دن روانگی کا اذن مل چکا تھا۔ جزان موور نے تحریک کو پھیلنے کے لئے ابوالقاسم کو ایک خط کے ذریعے اپنے جذبات سے آگاہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بے ضمیر لوگوں کی مسلسل خریداری کے لئے بڑی مقدار میں سنہری کرنسی بھی بھیجی گئی تھی۔

"حیرت انگیز... واقعی یہ خدا کا کرشمہ ہے۔" سن رسیدہ طبیب نے ابو عامر کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔ ثمامہ اور اسماء دونوں ہی چارپائی کے قریب کھڑی تھیں اور غور سے طبیب کی بات سُن رہی تھیں۔ ان سے قدرے فاصلے پر یعقوب کھڑا تھا۔ طاہر جو کچھ دیر پہلے طبیب کو بُلا کر لایا تھا کسی ضروری کام سے باہر گیا تھا۔

"اب میں پُر اُمید ہوں کہ زخمی نوجوان بہرحال بچ جائے گا یقیناً یہ آپ لوگوں کی شب و روز اور انتھک محنت کا نتیجہ ہے۔" طبیب ابو عامر کے بارے میں تفصیل بتا رہا تھا۔ "پہلے تو میرا خیال تھا کہ زخمی چند روز کا مہمان ہے لیکن صرف پندرہ دن میں یہ اللہ کی مہربانی کا بھی معاملہ ہے کہ اس نے

نوجوان کو زندگی عطا کر دی ہے۔"

"حکیم صاحب" اسماء نے جھجکتے ہوئے کہا "یہ کب تک ہوش میں آجائیں گے۔"

"بس دو ایک دن کی بات ہے" حکیم نے جواب دیا "بہت ممکن ہے آج دن میں ہی یا رات کے کسی پہر میں نوجوان آنکھیں کھول دے گا"

حکیم صاحب کی باتیں سن کر دونوں لڑکیاں خوشی سے کھل اٹھیں۔ یعقوب بھی کافی مطمئن نظر آرہا تھا۔ ابو عامر اگرچہ اب تک بے ہوش تھا۔ اس کے پورے جسم پر سفید باریک کپڑے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں لیکن پندرہ دنوں میں کچھ فرق محسوس کیا جا سکتا تھا۔ پہلے کی نسبت بہت سے زخم اب یا تو بھر گئے تھے یا بھرنے لگے تھے۔ چہرے پر اور جو زردی اور مردنی سی چھائی ہوئی تھی وہ بھی اب بتدریج گھٹ رہی تھی۔ زخمی نوجوان کا تنفس بھی اب دھیرے دھیرے معمول پر آرہا تھا۔

حکیم صاحب نے رخصت کی اجازت چاہی تو یعقوب انہیں دروازے تک چھوڑنے گیا۔ مگر جب واپس ہونے لگا تو اس نے طاہر کو دیکھا جو کسی اجنبی کے ساتھ اسی طرف آرہا تھا۔ کچھ سوچ کر یعقوب دروازے پر ہی ٹھیر گیا۔

قریب آکر دونوں نے یعقوب کو سلام کیا اور مصافحہ کے بعد طاہر نے اجنبی کا تعارف کرایا۔

"چچا جان۔ یہ یاسر بن رباح ہیں۔ غرناطہ سے آتے ہیں۔ بازار میں

اچانک ان سے ملاقات ہو گئی تھی۔ یہ اتفاق ہے کہ انہوں نے مجھ سے آپ کا پتہ پوچھا اور میں آپ سے ملاقات کے لیئے انہیں ساتھ لے آیا۔"

"تم نے بہت اچھا کیا طاہر" یعقوب نے کہا "آؤ اب ہم اندر چل کر بیٹھیں۔ وہاں آرام سے باتیں ہوں گی۔"

عامر اور یاسر دونوں یعقوب سے باتیں کرتے ہوئے مکان میں داخل ہو گئے۔ احتیاطاً انہیں ایک دوسرے کمرے میں بٹھایا گیا۔ اس کے برابر والے کمرے میں ابو عامر بے ہوش پڑا تھا اور دونوں لڑکیاں حسب معمول باری باری اس وقت بھی مریض کی تیمارداری کر رہی تھیں۔

اگرچہ عمارہ بھی زخمی کے لیئے سخت مضطرب تھی۔ اس کے دل میں بھی ابو عامر کے لیئے بڑی ہمدردی اور گنجائش پیدا ہو گئی تھی مگر اسماء کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اس دوران وہ بمشکل چند راتوں میں سو پائی تھی اور وہ بھی عمارہ کے مجبور کرنے پر۔ ورنہ وہ زخمی نوجوان کو ایک لمحے کے لیئے بھی تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی رات بھر دونوں لڑکیاں باری باری تیمارداری کیا کرتی تھیں۔ جبکہ دن میں طاہر اور یعقوب ان کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔

یعقوب نہایت ذہین آدمی تھا۔ ملک کے حالات سے بھی گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ اسی لیئے اس نے ابو عامر کو سب کی نگاہوں سے بچائے رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اجنبی شخص جس نے خود کو یاسر کہہ کر متعارف کرایا تھا ادھیڑ عمر کا تھا۔ بشرے سے پاک صاف اور لہجے سے شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔

وہ پوری طرح مسلح تھا اور اپنا گھوڑا سرائے میں چھوڑ کر آیا تھا۔ یعقوب تھوڑی دیر کے لئے اندر چلا گیا مگر چند لمحوں کے بعد وہ پھر ان کے درمیان موجود تھا۔

"تو آپ غرناطہ سے آ رہے ہیں؟" یعقوب نے واپس آکر یاسر کو مخاطب کیا "سنا ہے آج کل وہاں بڑا امن و سکون ہے۔ ایک مرتبہ پھر فارغ البالی کا دور دورہ ہے۔"

یعقوب نے سوچ سمجھ کر ایسا انداز اختیار کیا تھا جس سے یاسر اس کے بارے میں کوئی خاص رائے قائم نہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اگر وہ کچھ سیاسی معاملات سے دلچسپی رکھتا ہے تو کھل جائے۔

"امن و سکون" یاسر بن رباحہ کے ہونٹوں پر درد بھری مسکراہٹ نمودار ہو گئی "اگر تاریک مستقبل، باہمی آویزشوں اور اندرونی ریشہ دوانیوں کو امن و سکون کہا جا سکتا ہے تو میرے خیال میں آپ کی بات بالکل درست ہے۔ ورنہ۔۔۔"

یاسر کچھ کہتے کہتے رک گیا تو طاہر نے لقمہ دیا "سنا ہے ابو عبداللہ اپنی حرکتوں پر بہت متاسف ہے اور اب اس نے گمراہ وزیر اعظم ابوالقاسم کو بھی معتوب قرار دیدیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ان افواہوں میں کوئی صداقت نہیں ہے" یاسر نے آزردگی کے ساتھ جواب دیا "اصل میں ابو عبداللہ پوری طرح محلاتی سازشوں کا شکار ہو چکا ہے اگر اب وہ ان کے جال سے نکلنا بھی چاہے

تو ناممکن ہے۔"

طویل سانس خارج کر کے یعقوب نے دونوں کی طرف اُداس نظروں سے دیکھا۔

"اندلس کی سرزمین آج پھر کسی طارق بن زیاد کو پکار رہی ہے۔" طاہر پُرجوش انداز میں بولا۔ "ہمارے اسلاف نے اسلام کی جو شمع اسپین میں روشن کی تھی آج وہ بے بسی سے آنسو بہا رہی ہے اور اس کے پروانے اس سے بیگانے نظر آتے ہیں۔"

"نہ صرف بیگانے بلکہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی سرزمین کو چند سکوں کے عوض فروخت کر رہے ہیں۔ افسوس کہ ہم میں آج ایسے لوگ بھی پیدا ہو چکے ہیں جو کھلے عام شعائرِ اسلام کا نہ صرف مذاق اُڑا رہے ہیں بلکہ زر، زن اور زمین کی خاطر اغیار کے دین میں شامل ہو رہے ہیں۔" یاسر نے بڑے دردبھرے انداز میں حالات کی تصویر کشی کی تھی۔ ان باتوں کی وجہ سے ماحول کافی اُداس ہو گیا تھا۔

عمارہ ضیافت کا سامان لے کر وہاں پہنچی تو اجنبی اور طاہر سر جھکا کر بیٹھ گئے تھے۔ حسین و جمیل لڑکی نے اپنا نصف چہرہ نقاب میں چھپا لیا تھا مگر اس کی ہرنی جیسی مخمور آنکھیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں سے ہی اس کی سادگی معصومیت اور خلوص کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ عمارہ فوراً ہی واپس چلی گئی تھی۔ مگر طاہر کی محویت اس کے بعد بھی کافی دیر تک رہی۔

"میرا خیال ہے عمارہ اجنبی ضرور کسی خاص مقصد سے آیا ہے" اسمار نے اپنی سہیلی عمارہ سے کہا۔

"ابا نے بتایا ہے کہ وہ اپنے کسی عزیز کی تلاش میں ادھر آیا ہے۔ کہیں وہ اس نوجوان کو۔۔۔"

عمارہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکی۔ اب تک اس نے نوجوان کی واپسی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کا ننھا سا دل سینے میں بار بار پھڑ پھڑا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں چند دنوں میں ہی وہ اس نوجوان سے کافی متاثر ہو گئی تھی۔ اب تک عمارہ ایک مست ہرنی کی طرح بستی اور قریب کے پہاڑی علاقوں میں زقندیں بھرنے کی عادی تھی۔ یعقوب بھی اس کی چھوٹی موٹی شرارتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ بستی کے نوجوان اور اس کی ہم سن لڑکیاں عمارہ پر جان چھڑکتی تھی۔ عمارہ سب کے ساتھ مخلص تھی اور سب کے کام آتی تھی۔

یعقوب دس بارہ برس پہلے غرناطہ میں رہتا تھا۔ وہ تجارت کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں آیا جایا کرتا تھا۔ مگر جب سے ابو عبداللہ برسر اقتدار آیا تھا، یعقوب نے غرناطہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا تھا۔ یاسر بن ناصر سے مکمل کوائف دریافت کر کے وہ اس شخص سے مطمئن ہو گیا تھا۔ یاسر کے بعض رشتہ داروں سے وہ خود بھی واقف تھا۔

"اسمار اسمار" عمارہ جلد ہی سے کچھ سوچ کر بولی "اگر یہ چلا گیا تو۔۔۔"

"تو۔ تو کیا ۔ ؟" اسمار ضبط کر کے بولی ۔ "بہر حال اسے تو ایک دن جانا ہی ہوگا۔"

"نہیں نہیں ۔ یہ نہیں ہو سکتا" عمارہ کے منھ سے بے اختیار نکل گیا ۔

"کیوں ۔ ؟" اسمار نے چونک کر سہیلی کی طرف دیکھا "تو کیا تم اسے روک لوگی یہ رک جائے گا ۔"

"کوشش ضرور کروں گی" عمارہ نے صاف طور سے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا تھا ۔ اسمار کے دل میں زبردست بھونچال سا آ گیا ۔ ضبط کرنے کے باوجود اس سے وہاں ٹھیرنا دوبھر ہو گیا ۔ سینے میں دل زور زور سے پھڑ پھڑا رہا تھا ۔ قسمت کی اس چال سے اسمار بدحواس تھی ۔

تقدیر نے دونوں سہیلیوں کو ایک ہی وقت میں ایک ہی راستے پر ڈال دیا تھا ۔ اسمار دل ہی دل میں یہ طے کر چکی تھی کہ وہ کسی مناسب وقت میں اپنے دل کی بات عمارہ کو ضرور بتائے گی ۔ مگر اس وقت یا تو ں ہی باتوں میں ایک ایسا موقع آ گیا کہ عمارہ پہل کرنے میں کامیاب ہو گئی ۔ اسمار اتنی خود غرض بھی نہیں تھی کہ وہ اپنی سکھی کا دل توڑ دیتی ۔ اس میں فطری شرم و حیا کی وجہ سے اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اس بات کے بعد اپنی کسی دلچسپی کا اظہار کر پاتی ۔ اس نے اپنے دل کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کی اور اس دوران عمارہ خدا جانے کیا کیا کہتی رہی ۔ وہ تو بس ہوں ہاں کرتی رہی ۔ اس وقت خدا جانے اس کے دل و دماغ کو کیا ہو گیا تھا ۔ وہ اسے لے کر نہ جانے

کہاں کہاں کی سیر کر رہے تھے۔

"عمارہ بیٹی کہاں ہو؟" یعقوب اس طرف پکارتا ہوا نکل آیا۔

"میں یہاں ہوں ابا۔ کیا بات ہے؟" وہ بولی۔

"بیٹیا۔ آج تم دونوں بہنیں مل کر کچھ اچھا سا طعام تیار کرو۔ یاسر جو غرناطہ سے آیا ہے، ہمارے دوست کا بیٹا ہے اس طرح خدا نے ہمیں میزبانی کا موقع عطا فرمایا ہے۔"

"اچھا ابا۔ مگر یہ بتائیے کہ یاسر کس کو تلاش کرنے آئے ہیں؟" عمارہ نے پوچھا۔

"ابھی اس کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے دوپہر کے بعد مزید گفتگو ہو گی۔ اس وقت تو میں نے یاسر کو آرام کرنے کے لئے برابر والے کمرے میں بھیجدیا ہے۔"

"اور طاہر کہاں ہے؟" عمارہ نے یوں ہی دریافت کر لیا۔

"وہ اپنے گھر تک گیا ہے۔ مگر شام سے پہلے واپس آجائے گا۔" یعقوب نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ دونوں لڑکیاں اس کی ہدایت پر اسی وقت باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

ساحل سمندر سے چند میل دور غرناطہ کے جنوبی حصے میں جہاں نہری نظام آب پاشی کا جال پوری وادی الکبیر میں پھیلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی شب و روز انتھک محنت کی وجہ سے اسپین کا یہ علاقہ جو کبھی صرف صحرا یا بنجر علاقہ تھا اب مدت سے سرسبز و شاداب تھا۔ ہر طرف سبزہ لہلہا رہا تھا۔ دور دور تک جنگل کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ غربی علاقے میں گھنا جنگل تھا جہاں بشیر نامی ایک پرجوش نوجوان نے اپنے ساتھ بہت سے مجاہدوں کو شامل کر کے وہ محاذ کھولا تھا جو اندلس میں آخر دم تک مسلمانوں کے دشمنوں سے برسرپیکار ہونے کا عزم رکھتا تھا۔

شمالی حصہ انتہائی دشوار گزار علاقہ تھا جہاں سے رسل و رسائل کا کوئی

امکان نہ تھا۔ دور دور تک چھوٹی بڑی پہاڑیوں کے علاوہ خطرناک گھاٹیاں غار اور مہیب ڈھلوانیں تھیں۔ اس طرف کسی کو صرف شامت اعمال ہی لے جاسکتی تھی۔ ملک کے اس حصے کو ہر دور میں عضو مجہول سمجھا گیا تھا۔ مگر جب سے غرناطہ کے سیاسی اُفق پر مسلمانوں کی زبوں حالی کے بادل چھائے تھے یہ پُر خطر وادی اور مہیب غار بھی آباد ہو گئے تھے۔ حامد بن زہرا اور اس کے جاں نثار دوستوں نے ایک خاصی بڑی جمعیت یکجا کر لی تھی ۔۔ یہ سب کے سب وہ لوگ تھے جو اندلس کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ حامد کے سامنے ہزاروں مسائل تھے مگر وہ اور اس کے ساتھی بڑی پامردی سے حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔

اس طرف سب سے بڑا مسئلہ رسل و رسائل کا تھا۔ جو مجاہدین اس علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ ان کے لیے غذا پانی اور ہتھیار بڑی جاں فشانی سے مہیا کیے گئے تھے۔ اس وقت بھی حامد بن زہرا اپنے معتمدوں کے ساتھ مخصوص غار میں موجود تھا۔

"میرا خیال ہے قاصد کو اب تک آجانا چاہیے تھا" عبید نے حامد بن زہرا کو مخاطب کیا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں ابوالحسن کو بلانے روانہ کر دوں"

"ہمیں تو مزید انتظار کرنا ہوگا عبید" حامد نے جواب دیا۔۔۔

۔۔۔ "ابوالحسن کو ہم نے مصعب کی ٹوہ میں لگایا ہے۔ بہت ممکن ہے وہ اس فتنے کو دبانے کے لیے ہماری کوئی اہم خدمات انجام دے سکے۔ کیا

ابوالحسن الغسانی رہ سے واپس آگیا ہے؟"

"جی ہاں"۔ عبید نے بتایا"وہ آج صبح ہی واپس آیا ہے۔ میں نے جبراً اُسے کچھ دیر گھر پر آرام کرنے کے لئے روک دیا تھا، ورنہ وہ اب تک پہنچ گیا ہوتا"

اس وقت ایک مجاہد نے آکر بتایا کہ ابوالحسن باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔ حامد نے سر کی جنبش سے اجازت دیدی چند لمحوں بعد ایک چاق چوبند خوبصورت نوجوان ان لوگوں کے سامنے کھڑا تھا۔

"ہمارا خیال ہے تم ضرور ہمارے لئے کچھ کارآمد خبریں لے کر آئے ہو ابوالحسن"

حامد بن زہرا نے نوجوان کو مسکرا کر دیکھا۔ ابوالحسن کافی خوش نظر آرہا تھا۔

"آپ نے درست فرمایا" ابوالحسن نے جواب دیا"مصعب دراصل ابوالقاسم کا رشتہ دار ہے اور ابوالقاسم اسے بھی ایک بڑی جاگیر دلانے کے لالچ میں اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوچکا ہے۔ مصعب کا یہ مشن بہت اہم تھا۔ غدار ابوالقاسم نے مصعب کے ذریعے ڈان مور گورنر مالقہ کو بہت اہم پیغام روانہ کیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں مصعب کو کیفر کردار تک نہ پہنچا سکا"

ابوالحسن قدرے خاموش ہوا تو حامد نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"تاہم خدا کا شکر ہے کہ میں مصعب کے چار ساتھیوں کو قتل کرنے

میں کامیاب ہو گیا۔ ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس نے مجھے کئی کام کی باتیں بتائی تھیں"

ابو الحسن نے ایک نظر اپنے والد کی طرف دیکھ کر پھر سے کہنا شروع کیا۔

"میں چونکہ تنہا تھا اور وہ دس افراد تھے، وہ مجھ سے پہلے مالقہ پہنچ چکے تھے۔ کیونکہ مصعب نے سخت خطرناک اور مختصر راستہ اختیار کیا تھا۔ لیکن واپسی میں اسے کوئی عجلت نہیں تھی۔ مالقہ سے روانگی کے بعد میں نے پہلی رات شبخون مارا جس کے نتیجے میں مصعب کے چار ساتھی کام آ گئے۔ مگر --- --- --- --- --- --- --- مصعب اور اس کے بقیہ پانچ ہمراہی رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

"مالقہ کے مسلمانوں کا کیا حال ہے؟" حامد نے پوچھا "کیا تم نے وہاں کے قاضی سعد الدین سے ملاقات کی تھی؟"

"جی ہاں۔ میں ان سے ملا ہوں" ابو الحسن نے کہا۔ "قاضی سعد الدین نہایت زیرک اور مدبر انسان ہیں انہوں نے مجھے تمام سہولتیں بہم پہنچائیں۔ وہ میرے ساتھ کچھ آدمیوں کو بھی روانہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے خوبصورتی سے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔"

"اچھا ہوا۔ ابھی ہم اس معاملے کو طول نہیں دینا چاہتے" حامد نے عبید کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لیکن جناب" ابوالحسن بول پڑا۔ "قاضی سعد الدین کا خیال ہے اگر بلنسیہ کا فی الفور دفاع نہ کیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ چند ہفتوں میں ہی وہاں کا غدار قوم عامل عبدالرحمٰن بلنسیہ کو فرڈی نینڈ کی تحویل میں دے دیگا۔"

"کیا اس قسم کے کچھ شواہد دستیاب ہوئے ہیں؟" حامد بن زہرا نے دریافت کیا۔

"مصعب کے ہاتھ ابوالقاسم نے جو پیغام گورنر ڈان کو روانہ کیا تھا اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ عیسائیوں کو جلد سے جلد بلنسیہ کا قصہ ختم کر دینا چاہیئے۔ اس طرح وہ اندلس کے مسلمانوں کی بہت بڑی مدافعت کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"ہرگز نہیں۔" اچانک حامد کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر تلوار کے قبضے پر چلا گیا تھا۔ کچھ یہی عالم عبید کا تھا۔ دونوں کو سخت غصہ آ گیا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں تاخیر نہیں کرنا چاہیئے حامد۔" عبید نے رائے دی۔

"میری ناقص رائے بھی یہی ہے جناب۔" ابوالحسن نے مؤدبانہ عرض کیا۔

"طلحہ۔ مالک اور بشیر سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کر لیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بہت جلد کوئی اقدام کریں۔ ہمیں غرناطہ کی اس پہلی فصیل بلنسیہ کو ہر قیمت پہ بچانا ہو گا۔"

حامد بن زہرا بات ختم کر کے اٹھ گیا تھا۔ اس لئے عبید اور ابوالحسن

بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئے۔ غار کے اس بہت بڑے حصے میں
دن کی روشنی سے پورا ماحول جگمگا رہا تھا۔ ہزاروں افراد اسلحہ سازی
اور فنونِ حرب کی مشقوں میں مصروف تھے۔ حامد بن زہرا اور اس کے ساتھی
جس طرف سے بھی گزرے انہیں لوگوں نے والہانہ طور پر اس طرح نگاہوں
سے خوش آمدید کہا کہ مشق میں کوئی فرق نہ آیا اور یہ اس مجاہد کا
حکم تھا۔ وہ بے جا ٹھاٹ باٹ اور غیر فطری آداب کا قائل نہیں تھا۔
چلتے چلتے وہ اچانک رکا اور مڑ کر ابوالحسن سے مخاطب ہو گیا۔
"ابوالحسن، الفجارہ ہمارے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔
تم اسی وقت الفجارہ چلے جاؤ۔ تمہیں مصعب کی صرف نگرانی کرنا ہے ۔
اسے قتل کرنے سے بعض قبائلی جھگڑے پیدا ہوں گے۔"
جب حامد بن زہرا اپنی بات ختم کر چکا تو ابوالحسن پوری طرح اس کا مطلب
سمجھ چکا تھا۔ اذن ملتے ہی وہ غار کے اس دہانے کی طرف نکل گیا جہاں اس کا
بہترین گھوڑا اپنے مالک کا منتظر تھا عبید نے عندیہ پا کر ساتھیوں کو بلانے
کے لئے کچھ آدمی دوڑا دیئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جگہ وہ تمام اکٹھے
ہو گئے تھے۔ ان میں طلحہ۔ مالک اور بشیر سرفہرست تھے۔
"یہ ہیں وہ حالات جو قاضی سعد الدین نے ابوالحسن کے ذریعے
ہم تک بھیجے ہیں۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ دشمن دھیرے دھیرے
ہماری شہ رگ یعنی غرناطہ کی طرف بڑھ رہا ہے ملکہ ازبیلا اور فرڈی
نینڈ جنگ میں ہر قسم کے حربے اختیار کر رہے ہیں۔ اب وہ ہمارے

ایک تمام فوجی مستقر بلنسیہ کو ہم سے کاٹ دینا چاہتے ہیں تاکہ پھر وادی الکبیر تک ان کا راستہ صاف ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس وادی کو ہدف بنانے میں دیر نہیں کریں گے۔ ہمیں دشمن کی عیاری سے کہیں زیادہ خطرہ ان گھر کے بھیدیوں سے ہے جو محض دولت کی طمع میں اندھے ہو چکے ہیں اور دولت کے لئے غیرت، آبرو۔ حتیٰ کہ ملک و قوم کو بھی داؤ پر لگا دینا چاہتے ہیں۔ سلطان الناصر کا الحمرا آج سازشوں کا اکھاڑا بن چکا ہے۔ المرلیغری اور موسیٰ جیسے ہمارے بہادر سپاہی ہم سے بچھڑ چکے ہیں۔ یہ ہیں وہ حالات جن پر غور کرنے کے لئے میں نے آپ لوگوں کو زحمت دی ہے۔"

"وادی الکبیر کے لئے ہم اپنی جانیں لڑا دیں گے جناب!" بشیر نے کہا۔ "لیکن آپ کی یہ رائے بہت مناسب ہے کہ دشمن کو بلنسیہ سے پہلے ہی روک دیا جائے۔"

"بلنسیہ نکل گیا تو ہماری مدافعت کمزور پڑ جائے گی۔" ابوطلحہ نے رائے دی۔

"اور تمہارا کیا خیال ہے عبید؟" حامد بن زہرا نے عبید کی طرف دیکھا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں آج رات کو ہی کچھ دوستوں کے ساتھ بلنسیہ کا رخ کر سکتا ہوں۔"

"ہمیں تم سے یہی امید تھی دوست!" حامد نے عبید کے شانے پر

ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ دشمن کو دوسرے علاقوں میں اُلجھایا جاتے۔" طلحہ نے مزید کہا۔ "اگر آپ حکم دیں تو میں یہ کام بخوبی انجام دے سکتا ہوں۔"

"جزاک اللہ۔" حامد نے ستائش کی۔ "بس یہی طے پایا ہے کہ عبید پانچ ہزار ساتھیوں کے ساتھ آج رات کو بلنسیہ کی طرف کوچ کریں گے۔ اور اتنے ہی مجاہد طلحہ کے ساتھ دور دراز کے سرحدی علاقوں کی طرف جائیں گے۔ بلاشبہ یہ سفر بہت جان جوکھوں کا ہوگا۔ مگر مجاہدوں کے لئے کوئی مشکل نہیں ہوتی۔"

عبیداللہ اور طلحہ انتظامات کے لئے جا چکے تھے۔ حامد زہرا کچھ ضروری کام نمٹانے کے بعد جب دوبارہ اپنے مسکن پر پہنچا تو وہاں دو اجنبی اسکے منتظر تھے۔

"میرا نام ابو عامر ہے محترم سردار اور یہ میرے ساتھی عماد ہیں۔"

حامد نے غور سے ابو عامر کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی ان کے سامنے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ دونوں نوجوان ادب سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

"جہاں تک میرا خیال ہے تم مالقہ کے وہ قاصد ہو جسے ہمارے دوست اور مالقہ کے مسلمانوں کی جان عیاض نے ہمارے پاس روانہ کیا تھا۔"

"درست فرمایا۔" ابو عامر بولا "میں راستے میں ایک مصیبت کا

شکار ہو گیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ اس طرح بلنسیہ کے بعض بہت اہم کوائف حاصل ہو گئے ہیں اور یہ کام عماد اور یعقوب کی مشترکہ کوشش سے ہوا ہے۔ یہ اس لئے بھی میرے محسن ہیں کہ اگر یہ نہ ہوتے تو آج میری لاش کسی بیابانے یا ویرانے میں سڑ گل چکی ہوتی۔"

حامد بن زہرا دیر تک ان لوگوں سے تبادلہ خیال کرتا رہا۔ اس نے اٹھنے سے پہلے ان لوگوں کی خواہش کے مطابق ابو عامر اور عماد کو بلنسیہ کی مہم کے لئے عبیدہ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔

دن بھر کی جنگ میں بھی جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو بلنسیہ میں مقیم ابو عبداللہ کی فوج اور مجاہدین رات کو بھی ایک دوسرے کے خلاف صف آراء رہے۔ محاذ جنگ کافی طویل ہو چکا تھا مگر یہ اتفاق تھا کہ عماد، ابو عامر، طاہر اور یعقوب آس پاس ہی جنگ کر رہے تھے۔ دونوں طرف سے مسلمان ہی آپس میں دست و گریبان تھے۔ مرنے والے بھی مسلمان تھے اور مارنے والے بھی مسلمان نصرانیوں کی چالوں نے بالآخر مسلمانوں کو آپس میں ہی لڑا دیا تھا۔ اس طرح ان کی طاقت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

اچانک ابو عامر نے اپنے قریب ایک نسوانی چیخ سنی دشمن کے سپاہی نے ان کے کسی مجاہد کو قتل کر دیا تھا۔ ابو عامر نے کسی غیر شعوری خیال کے تحت گرتے ہوئے نوجوان کو سنبھال لیا اور جنگ کے شعلوں سے دور لے گیا۔ مگر کم سن مجاہد نے راستے میں دم توڑ دیا تھا۔ روشنی میں جب ابو عامر کی نگاہ اس کے لباس کی طرف گئی جو اب بے ترتیب ہو چکا تھا تو وہ غم کے سمندر میں

ڈھیر بننے لگا۔ اسماء دم توڑ چکی تھی۔ اسماء کسی وقت مجاہد کے بھیس میں میدان جنگ میں آ گئی تھی۔

دوسری صبح کو اگرچہ مجاہدین نے عبدالرحمان کی فوجوں کو شکست دے کر بلنسیہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر انہیں اس فتح کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ ان کے نصف مجاہد شہید ہو گئے تھے اور ان میں ان کا سپہ سالار اور مجاہد اعظم کا دست راست عبید بھی تھا جو اپنے خون میں نہا کر شہادت عظمیٰ کے مرتبے پر فائز ہو چکا تھا۔

اس جنگ میں یعقوب اور طاہر نے بھی جام شہادت نوش کر لیا تھا مگر یعقوب نے آخری سانسوں کے وقت ابو عامر سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ اب وہ بلنسیہ میں ہی قیام کرے گا اس کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ یعقوب نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ابو عامر اس کی بیٹی عامرہ سے عقد کر لے اور اس کا یہ اکار بار سنبھال لے۔

دوسرے دن اندلس کے آخری سپاہی اور تحریک کے مجاہد اعظم حامد بن زہرا کے لئے جو قاصد فتح کی خوش خبری لے کر روانہ ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سمندر بھی موجزن تھے۔ وہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ اس کو فتح کہیں یا مسلمانانِ اندلس کی شکست۔

سعادت حسن منٹو۔ اردو کا بہت بڑا افسانہ نگار

منٹو کو زندگی کم ملی، پر بڑی جھیلنے والی زندگی۔ اور وہ ساری عمر اس سے کھیلتا، اُسے چڑاتا رہا اور کم وقت ملنے کے باوجود بہت سی عمروں سے بڑا تخلیقی سرمایہ ہماری نذر کر گیا۔ اُسے مرے ہوئے اب ۳۰ سال ہونے رہے ہیں۔ ان ۳۰ سالوں میں اردو کے کتنے قد آور افسانہ نگار پرانے ہو گئے، مگر منٹو آج بھی نیا ہے، آج بھی تازہ ہے۔ آج بھی زندہ۔ بار بار پڑھے جانے پر بھی وہ اپنی افادیت اور اہمیت نہیں کھوتا بلکہ اس کی سرکشی اور سرکشیدگی پہلے سے کچھ سوا ہی نظر آتی ہے۔ اردو کے اس سب سے بڑے، مشہور اور بدنام مصنف کی کتابیں عرصہ دراز سے نایاب تھیں۔ ساقی بک ڈپو نے ان کے نئے ایڈیشن شائع کیے ہیں۔

ٹھنڈا گوشت	۱۸/=	گنجے فرشتے	۲۴/=
دھواں	۱۲/۵۰	تلخ، ترش اور شیریں	۱۵/=
بانجھ	۲۴/=	لذت سنگ	۱۱/=
بغیر عنوان کے	۱۱/=	پھندنے	۱۴/=
بادشاہت کا خاتمہ	۱۵/=	تین عورتیں	۹/=

آتش پارے اور سیاہ حاشیے ۱۸/=

جنازے ۱۵/=

معیار کی کتابیں

خمارِ گندم - ابن انشا ۱۲/۵۰ — اردو کی آخری کتاب - ابن انشا ۱۲/۵۰

اٹھتی لکیر - انیس مرزا ۲۷/= — نقشِ صفی - ابن صفی ۲۰/=

آخری شعلہ - ابن صفی ۲۵/= — خلیفہ - ابن صفی ۲۵/=

فرشتہ محبت کا غمزدہ بانو عرشی ۱۰/= — خمارِ قلم - ابن صفی ۲۵/=

انکا - حصہ اول - جمیل احمد خان ۳۵/= — انکا حصہ دوم - جمیل احمد خان ۳۵/=

سیاہ بیولا - جہانگیر اشرفی ۴۰/= — ٹائیگر حصہ اول ایم اے قریشی ۳۰/=

ٹائیگر - حصہ دوم - ایم اے قریشی ۳۰/= — ٹائیگر حصہ سوم " " " ۳۰/=

ٹائیگر - چہارم - ایم اے قریشی ۳۰/= — بابک خرمی - عبدالحلیم شرر ۱۰/=

پیا فرکا اوندہ - ابو ظہیر دینی ۲۰/= — تیری یاد آئی - انیس مرزا ۱۳/=

اے دلربا تیرے لئے - شوکت تھانوی ۱۲/= — نکلا کمرہ تھا نے جا - ابراہیم جلیس ۱۱/=

اوپر شیروانی اندر پریشانی ابراہیم جلیس ۱۱/= — سلطنت خداداد - محمود خان محمود ۵۰/=

آبرو - حمیدہ جبیں ۲۰/= — چھلاوہ حصہ اول - صبیحہ بانو ۲۵/=

چھلاوہ حصہ دوم - صبیحہ بانو ۲۵/= — تحریکِ آزادی یکجہتی - مولانا ابوالکلام آزاد ۱۵/=

سیرت اقبال - ڈاکٹر سید عبداللہ ۳۰/= — غازی اعظم - مولوی شاہ ابوالحسن ۱۵/=

عرب کا چاند - صادق حسین ۲۰/= — اکبر اعظم - صادق حسین ۱۲/=

ہلاکو خاں - یونس اختر ۲۰/= — فن جوڈو (باتصویر) ۲۰/=

عرب اسرائیل جنگ کی خفیہ باتیں (باتصویر) ۱۰/=

آسان کیمرا ایڈ (باتصویر)	۱۲/۵۰	ہپناٹزم کیا ہے ؟	۲۰/=
ہپناٹزم کے عملی طریقے	۲۰/=	ٹیلی پیتھی گائیڈ	۲۵/=
فن کشتی و اکھاڑہ	۱۰/=	آئینہ بینی و عمل حاضرات	۱۰/=
تعبیر نامہ و خواب نامہ (مکمل)	۲۰/=	دنیا کے چھپے اسرار علوم	۱۵/=
طالوت - حصہ اول	۳۰/=	طالوت - حصہ دوم	۳۰/=
طالوت - حصہ سوم	۳۰/=	ہمزاد	۳۵/=
سونا گھاٹ کا پجاری	۳۵/=	قیامت، انسان کی خونی داستان	۲۵/=
شہ زور - حصہ اول	۲۰/=	شہ زور حصہ دوم	۳۰/=
بانگڑو حصہ اول	۳۰/=	بانگڑو حصہ دوم	۳۰/=
شہباز حصہ اول	۳۰/=	شہباز حصہ دوم	۳۰/=
مریخ کے انڈے	۱۰/=	نام اور اس کے اثرات	۱۰/=
عملیات تسخیر قلوب	۱۰/=	سہاگ رات	۱۰/=
جنسی مسائل	۱۰/=	جنسی صلاحیت بڑھائیے	۳۰/=
جنس اور ہم	۱۰/=	جدید ریڈیو گائیڈ	۲۰/=
فوٹوگرافی	۱۵/=	ٹی وی ریپیئر گائیڈ	۱۰/=
میڈیکل گائیڈ	۱۵/=	ہومیوپیتھک ڈاکٹر	۱۰/=
انجکشن گائیڈ	۱۰/=	اپاریشن گائیڈ	۱۵/=
خفیہ جنسی راز	۲۰/=	یاسر عرفات	۱۰/=
میری بھابی	۱۰/=	غبارہ - سراج النور	۲۴/=